تیسرا اڈیشن

(دیباچہ)

"حسرت موہانی" کا یہ تیسرا اڈیشن ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کیا
ا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ اڈیشن بھی اسی قدر مقبول ہوگا جس قدر کہ پہلے دو
ن مقبول ہو چکے ہیں، اس اڈیشن میں دو چھوٹے چھوٹے ابواب کا اضافہ
یا گیا ہے۔ ایک باب میں حسرت کی زندہ جاوید شخصیت ذرا اور اُجاگر کردی
ہے، اور دوسرے باب میں یہ امر زیر بحث ہے کہ حسرت نے کن کن
سے استفادہ کیا اور کن کن شعرا کے کلام کا رنگ ان کے ہاں پایا
ا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب قدرے اور مکمل ہو گئی اور اس کی افادیت
کچھ اضافہ ہوا۔

انوار بک ڈپو لکھنؤ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے یہ اڈیشن چھاپنے
ر شائع کرنے کی ہمت کی،

محلہ بہوڑ، بریلی
یکم دسمبر ۵۳ء

عبدالشکور

فہرست مضامین حسرت موہانی تیسرا ایڈیشن

پیدائش تعلیم اور ابتدائی زندگی

(۵ تا ۱۲۹)

انتخاب کلام

(۱۳۲-۲۰۰)

پیدائش، تعلیم اور ابتدائی زندگی

خاندانی حالات حسرت کا وطن موہان[1] (ضلع اناؤ) ہے۔ انکا نام ہے سیّد فضل الحسن۔ مگر ان کے نام سے کہیں زیادہ ان کا تخلص مشہور ہوا۔ یہ نیشاپوری خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے جو توابع لکھنؤ میں عرصہ دراز سے آباد ہے۔ اپنے نیشاپوری تعلق کا حسرت نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

کیوں نہ ہوں اُردو میں حسرت ہم نظیریؔ کی نظیر
ہے تعلق ہم کو آخر خاکِ نیشاپور سے

---

[1] "یونان کو مدت سے تھی موہان سے نسبت"

موہان ہمیشہ حکماء اور اطباء کے لئے مشہور تھا۔ اور ہے اس لئے اسے موہان خطۂ یونان کہا جاتا ہے۔

ان کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی موسیٰ رضا تک پہونچتا ہے، جن کا مزار مشہد مقدس میں آجتک مرجع جمہور اسلام ہے، اور جن کے زمانہ حیات نیشاپوری کو ان کے وطن مبارک ہونے کا فخر حاصل تھا۔ حضرت امام رضا کی اولاد میں سے سید محمود نیشاپوری نے ترکِ وطن کر کے قصبہ موہان میں سکونت اختیار کی۔ ان کی دسویں پشت میں حضرت شاہ وجیہ الدین محمد قدس سرہ العزیز سنہ ۱۱ھ میں بمقام موہان پیدا ہوئے اور ۱۰ ر شوال سنہ ۱۲ھ میں انھوں نے انتقال فرمایا۔ انکا عرس ہر سال تاریخ مقررہ پر موہان میں ہوتا ہے۔ جس کے اخراجات کے لئے حسرت نے اپنی موروثی جائداد کا ایک حصہ بقدر ضرورت وقف کر دیا تھا۔ حضرت شاہ وجیہ تحصیل علوم کے بعد دہلی میں حضرت سید حسن رسول نما دہلوی کے سلسلۂ ارادت میں داخل ہوئے اور ہمیشہ کے لئے اپنی اولاد کو مسلکِ تصوف سے وابستہ کر گئے۔

حسرت سنہ ۱۲۹۵ھ بمقام موہان پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید ازہر حسن تھا۔

لہ
حضرت امام حسینؓ
حضرت امام زین العابدینؓ
حضرت امام محمد باقرؓ
حضرت امام جعفر صادقؓ
حضرت امام موسیٰ کاظمؓ
حضرت امام علی موسیٰ رضاؓ

ہم نے کی تھی جو دعا موسیٰ کاظم کے حضور ہو گئی بارگہ رب میں وہ یکسر منظور

(بہ سلسلۂ سفر عراق و کاظمین)

ان کو اپنی دادی صاحبہ کی طرف سے ضلع فتحپور ہسوہ تحصیل کھجوہ میں تین گاؤں وراثتاً ملے تھے جن کی آمدنی پر قناعت کرکے زیادہ تر ضلع فتحپور اور کمتر موہان میں زندگی بہ فراغت بسر کرتے تھے۔

ابتدائی تعلیم

حسرتؔ[1] کی ابتدائی تعلیم پرانی وضع کے ایک مکتب[2] میں ہوئی جہاں قرآن شریف ختم کرنے کے بعد انھوں نے فارسی اور عربی کا درس حاصل کیا۔[3] اور ۱۸۹۴ء میں انھوں نے اُردو مڈل کا امتحان اس اعزاز و امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ تمام صوبہ میں اوّل رہے۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم حاصل

---

[1] حسرتؔ کے ایک عزیز جناب سید فخرالحسن فطرت تھے۔ شعروشاعری کا ابتدائی عمر میں ذوق ان ہی کا فیض کرم تھا نیز یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ حسرتؔ کے خاندان میں کوئی عورت جاہل نہ تھی۔ ان کی نانی صاحبہ محترمہ و والدہ صاحبہ محترمہ اُردو، فارسی کی بہت اچھی استعداد رکھتی تھیں اور حسرتؔ کا بیان ہے کہ انکا ادبی اور شاعرانہ ذوق بہت شستہ تھا۔ حسرتؔ نے اپنی نانی صاحبہ محترمہ ہی کے فرمانے سے سب سے پہلے نسیم دہلوی کے کلام کا بغور مطالعہ کیا تھا۔

[2] حسرتؔ نے اپنے قدیم موہانی اساتذہ کو "آسودگانِ خاک" کے ذیل میں ہدیۂ شوق و محبت پیش کیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:۔

"میاں جی غلام علی مرحوم موہانی" "میاں جی بلاقی مرحوم موہانی" "استاد چنّا مرحوم موہانی"

ملاحظہ ہو دیوان حسرت موہانی حصہ نہم مرتبہ بیگم حسرت موہانی

مطبوعہ الناظر پریس طبع اول

صفحہ ۱۳

[3] استاد چنّا حسرتؔ کے خاندان کے بچوں کو ورزش اور لکڑی کے کرتب سکھاتے تھے

کرنے کی غرض سے حسرت موہان سے فتحپور (ہسوہ) گئے۔ جہاں ان کے والد کا قیام موروثی جائداد کے انتظام کی غرض سے اکثر رہا کرتا تھا۔ یہاں گورنمنٹ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے لگے اور رفتہ رفتہ فکر سخن بھی کرنا شروع کردی، فتح پور کے قیام میں جہاں تک معلوم ہوتا ہے دو استاد ایسے ملے جن کی شفقت تعلیم و تدریس نے حسرت کے ذہن اور دماغ پر گہرا اثر کیا، ان کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے۔

حضرت مولانا مولوی سید ظہور الاسلام مرحوم فتح پوری (بانی مدرسہ اسلامیہ فتحپور)

استاد فقیر مولوی حافظ نیاز احمد مرحوم بریلوی (ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول فتحپور)

استاد انگریزی فقیر

(دیوان حسرت موہانی حصہ ششم مرتبہ بیگم حسرت موہانی۔ مطبوعہ الناظر پریس طبع اول صفحہ ۳)

فتح پور پہنچنے سے پہلے ہی حسرت عربی اور فارسی کی کتب متداولہ ختم کر چکے تھے، اور ایک حد تک انکا ادبی ذوق پایۂ تکمیل تک پہونچ چکا تھا، علاوہ ازیں کردار اور اخلاق کے اعتبار سے بھی حسرت ایک ایسے جوان صالح تھے جو تصوف کی

لہ دو فارسی غزلیں بھی قیام فتحپور کے اس زمانہ کی یادگار ہیں جبکہ حضرت استاد یعنی مولانا ظہور الاسلام مرحوم نیز حضرت نیاز فتحپوری کے مرحوم والد ماجد کے فیض تربیت نے نظم و نثر فارسی کی مشق کا ایک خاص شوق پیدا کر دیا تھا۔

وہ صورتیں نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

(دیوان حسرت موہانی حصہ ہشتم مرتبہ بیگم حسرت موہانی مطبوعہ الناظر پریس طبع اول)

کی چاشنی اور اسلام کی محبت اپنے قلب میں پنہاں رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے ان اساتذہ نے ان کو یقیناً آغوش شفقت میں لیا ہوگا اور یہ اسی محبت اور شفقت کا نتیجہ ہے کہ حسرت کے دل میں ان کی یاد شکرگذاری کے جذبہ کے ساتھ محفوظ تھی۔ یہ بھی فتح پور ہی کا کوئی واقعہ ہوگا جس کا اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اب تک موجود ہے، کچھ کچھ لگائے تھے ہم
وہ جو اک پکا کبھی خاک جہان آباد سے

(کوڑا، جہان آباد۔ ضلع فتح پور)

حسرت کی شاعری کی ابتدا ۱۸۹۲ء سے ہوئی تھی لیکن ابتدائی آٹھ دس سال کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"طبع اول کے دیباچہ میں بیان ہو چکا ہے کہ ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۲ء تک کی

لہ "فتح پور میں مولانا کا زمانہ طالب علمی کئی اعتبارات سے یادگار رہے گا۔ اول تو مولانا نور محمد خاں صدر مدرس مولانا سید ظہور الاسلام صاحب اور مولانا حبیب الدین صاحب جیسے برگزیدہ و مقدس حضرات کا فیض صحبت ایک ایسی نعمت عظمیٰ تھی کہ پھر شاید ہی حسرت کو ایسی مقدس صحبت نصیب ہوئی ہو۔ ان کے علاوہ ان کے مخصوص احباب کی محبت بھی نہایت پاکیزہ اور لطیف تھی۔ اس بزم رنگین کے بعض افراد ایسے تھے جن کی لطیف ہستیاں مولانا حسرت کے جذبات شعری کے لئے محرک بن گئیں ان میں سے مولانا سید محمد ہاشم صاحب کے نام میں حسرت کے لئے بہت کشش اور جاذبیت تھی۔" (حالات حسرت صفحہ ۳)

سید ابوالہاشم مرحوم رسوا کو اس شعر میں یاد کیا ہے ؎

ان کی ہمنامی تو حاصل ہو گئی — غم نہیں حسرت جو رسوا ہو گیا

شاعری کا ایک بڑا مجموعہ نظموں، قصیدوں، قطعوں، غزلوں اور نظم انگریزی کے ترجموں کی شکل میں راقم حروف کے پاس موجود ہے جس کی نسبت گمان یہ تھا کہ نظرثانی کے بعد قابلِ اشاعت ہو جائے گا۔ لیکن بعد میں کچھ تو اس خیال سے کہ ابتدائی کلام کی اصلاح و ترقی کی یہ کوشش کوہ کندن و کاہ آوردن کے مصداق قرار پائے گی اور کچھ اس لحاظ سے کہ رفتہ رفتہ راقم الحروف کی طبیعت نے اپنے لئے اصنافِ سخن میں سے غزل کو اپنے حسبِ حال پاکر منتخب کر لیا ہے۔ اس کل مجموعہ خرافات کو یک قلم نظر انداز کر دیا۔۔۔۔۔"

(عبارت خاتمہ دیوان حسرت موہانی حصہ اول طبع ثانی، متعلق بہ ضمیمہ الف)

تعلیم علیگڈھ حسرت نے ۱۸۹۹ء میں اپنے قدیم مادر درسگاہ گورنمنٹ ہائی اسکول فتحپور سے انٹرنس کا امتحان اول درجہ میں خاص امتیاز کے ساتھ پاس کیا اس زمانہ میں بھی عربی، فارسی، اردو اور خصوصاً ریاضی میں حسرت موہانی کی استعداد بہت نمایاں تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد پرانے ایم اے او۔ کالج میں بحیثیت پروفیسر ریاضی آچکے تھے، گزٹ دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب نے حسرت کو علیگڈھ آنے کی دعوت دی، چنانچہ اسکول کی تعلیمی جدو جہد سے فارغ ہوکر حسرت علیگڈھ پہونچے، اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے شاگردوں میں شامل ہوگئے جو اس زمانہ میں ریاضی کے نہیں بلکہ منطق کے لکچرر تھے۔ ان کو کھیل کود سے کبھی کوئی لگاؤ پیدا نہ ہوا۔ علاوہ ریاضی کے، جو حسرت پروفیسر چکرورتی مرحوم سے پڑھتے تھے۔ حسرت نے عربی کا درس مولانا مولوی خلیل احمد صاحب مرحوم شمس العلماء اسرائیلی سنبھلی سے لینا شروع کیا۔ چنانچہ "ہدیہ شوق" دسمبر۔ ۔۔

اساتذہ ایں فقیر" کے ذیل میں

(۱) پروفیسر جے سی چکرورتی - استاد ریاضی۔

(۲) ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مارہروی اور

(۳) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں استاد قانون

کا ذکر کیا ہے اور "بہ آسودگانِ خاک" کے ذیل میں علیگڈھ کے مندرجہ ذیل اکابر مذکور ہیں :-

(۱) نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں مرحوم

(۲) نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرحوم اور

(۳) نواب حاجی محمد اسحاق خاں مرحوم

یہ وہ زمانہ تھا جب علیگڈھ کی تعلیم و تربیت کا غلغلہ ہندوستان بھر میں پھیلا ہوا تھا اور مسلمانوں میں نئی روشنی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ نامور اساتذہ علیگڈھ میں موجود تھے۔ ذہنی نشو و نما کے لئے ایم۔ اے۔ او کالج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مشہور ہو چکا تھا۔ اور سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے علیگڈھ کی سند حکام بالا دست میں مقبول ہو چکی تھی۔ حسرت ہمیشہ اس زمانہ کو محبت اور فخر کے ساتھ یاد کرتے تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سید سجاد حیدر یلدرم مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم۔ خان بہادر سید ابو محمد پروفیسر ظریف دہری۔ مسٹر محمد حیات (گوالیاری) حسرت کے ہمعصر تھے، اور شعر و سخن کی صحبتیں ان ہی حضرات کی وجہ سے اکثر گرم رہتی تھیں۔ ان کے بہت سے ساتھی سرکاری ملازمتوں میں کھپ گئے۔ چنانچہ اُن کی ذہنی صلاحیتیں دفاتر اور عدالتوں کی کارروائیوں کے نذر ہوئیں۔ دس بارہ

ہی ایسے بچے جو علم و ادب اور سیاست کے مردِ میدان نکلے۔ اگر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہزارہا مسلمان نوجوان علوم و فنون متداولہ حاصل کر کے سرکاری ملازمت کے سلسلے میں ایسے منسلک ہوئے کہ پھر نہ قومی معاملات سے ان کو سروکار رہا، اور نہ علم و ادب سے ان کا کوئی مفید تعلق باقی رہا۔ حسرت نے ۱۹۰۳ء میں علیگڈھ سے بی۔اے کا امتحان عربی، اور ریاضی اختیاری مضامین لیکر پاس کیا، لیکن اس امتحان کے پاس کرنے سے پہلے وہ سیاست اور وطن کی آزادی کے اس قدر دلدادہ ہو چکے تھے کہ تین مرتبہ حریت کا نعرہ بلند کرنے پر ایم۔اے، او کالج سے نکالے گئے۔ لیکن جو لو ان کے دل میں فروزاں ہو چکی تھی وہ سرد پڑنے کے بجائے روز بروز تیز تر ہوتی گئی۔ یہانتک کہ ان کی حیات، ان کی سیرت ان کی سیاست اور ان کی معاشرت کی تخلیق ہمیشہ اسی کی تپش کی مرہونِ احسان رہی۔

حسرت کے زمانہ میں علیگڈھ کی حالت ایک مہذب اور شائستہ دیسی ریاست سے زیادہ نہ تھی جس کی عنانِ حکومت آنریری سکریٹری کے ہاتھ میں ہوتی، اور وہاں کا انگریز پرنسپل ریاست کے ریزیڈنٹ کی اہمیت کا مالک ہوتا طلبا سرکاری ملازمتوں کے متوالے ہوتے اور حریت و آزادی کے نعرے اس فضا میں شورِ بے ہنگام سے زیادہ وقیع نہ سمجھے جاتے۔ چنانچہ اس کا تعجب نہیں ہے کہ کالج سے حسرت تین مرتبہ نکالے گئے بلکہ حیرت اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ آخر امتحان میں کیسے شریک کئے گئے۔

جرنلزم کی ابتدا

سنہ ۱۹۰۳ء میں امتحان دیتے ہی نتیجہ کے شائع ہونے کا انتظار کئے بغیر حسرت نے علیگڈھ ہی میں اُردوئے معلےٰ اسکا

ڈکلریشن داخل کر دیا۔ اس سے ان کے عزم راسخ کا پتہ چلتا ہے جو ان کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت تھی اور جس کی بدولت وہ طاقتور سے طاقتور رائے عامہ کی مخالفت کر سکتے تھے اور بڑے سے بڑے ماہر سیاست کے مدمقابل آسکتے تھے، جس زمانہ میں گاندھی جی ہندوستان کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے، جب مولانا محمد علی مرحوم مسلمانوں کے چشم و چراغ کی حیثیت سے ہر شخص اور ہر جلسہ میں پوجے جاتے تھے۔ حسرت نے اپنے معتقدات کی بنا پر حسب ضرورت ان کی بھی مخالفت کرنے میں کبھی پس و پیش نہ کیا، بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد حسرت وکٹوریہ کالج گوالیار میں ریاضی اور عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے بلائے گئے، اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ تھوڑی سی دوا دوش کے بعد کوئی اچھی سرکاری ملازمت مل جاتی، لیکن حسرت ارادہ کر چکے تھے کہ وہ جرنلزم اور سیاست نہ چھوڑیں گے اس لئے ملازمت حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ چنانچہ ایڈیٹر اردوئے معلّٰی کی حیثیت سے حسرت کالج سے فارغ ہو کر علیگڈھ شہر میں آباد ہوئے اور رفتہ رفتہ اُن کے رسالے نے ملک میں ایک خاص اہمیت، وقار اور بلندی حاصل کر لی، حسرت نے اس زمانہ میں مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ دو نہایت اہم اور مفید کام کئے، اول شعرائے متقدمین کے نایاب دواوین نہ صرف جمع کئے بلکہ ان کے انتخاب شائع کئے اور خود اردو علم و ادب اور سیاست کا گہرا مطالعہ کیا جس کی بدولت وہ سیاست اور فن شاعری میں آج تک مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں۔ گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ حسرت کی لائبریری میں ہزارہا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دواوین موجود ہیں، ظاہر ہے کہ ان کتابوں کے فراہم کرنے میں حسرت کو کس قدر

صعوبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا۔[1] اس پر لطف یہ ہے کہ ان تمام دواوین کا غائر نظر کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور بڑی محنت اور عرق ریزی سے ان کے انتخابات وقتاً فوقتاً اردوئے معلیٰ میں شائع کرتے رہتے تھے جن کی مجمل فہرست ذیل میں درج ہے۔

انتخاب سخن از حسرت موہانی

یعنی اردو زبان کے جملہ مستند اور صاحب دیوان شعرا کے نایاب کلام کا انتخاب حسب تفصیل ذیل:-

انتخاب سخن جلد اول سلسلۂ حاتم (حصہ اول) یعنی انتخاب دیوان شاہ حاتم، بقا، رنگین، نثار، بیدار، آبرو آں شاگردان حاتم۔ ماہر شاگرد سودا، اسیر، بیتاب برادر رنگین، عشرت، طالب معرفت شاہ حاتم (حصہ دوم) (یہ دیوان کہیں اور نہیں مل سکتے)

---

[1] اس سلسلہ میں حسرت نے ایک دلچسپ قصہ بیان کیا۔ ایک مرتبہ مولانا محمد علی و شوکت علی سے ملنے حسرت رامپور پہونچے، ان کی آمد کی خبر نواب حامد علی خاں بہادر مرحوم سابق والئی ریاست کو ہوگئی انھوں نے بڑے اصرار اور خوش اخلاقی سے حسرت کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ حسرت پہلے تو بہت گھبرائے اور نواب صاحب مرحوم تک جانے کے لئے کسی عنوان سے تیار نہ ہوئے لیکن نواب صاحب کے اصرار اور مولانا شوکت علی کے کہنے سے جانے پر راضی ہوئے، نواب صاحب بڑی خندہ پیشانی اور عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے اور بار بار یہی کہتے تھے کہ مجھ سے کوئی فرمائش کیجئے۔ حسرت نے آخر کار نواب صاحب کے کتب خانے سے وہ نایاب قلمی دواوین کی نقلیں طلب کیں جو ابتک حسرت کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر رامپور کے سفر میں نواب صاحب مرحوم سے ملاقاتیں ہوئیں، ممدوح نے حسرت کیلئے زادِ راہ وغیرہ کا بندوبست کرنا چاہا لیکن حسرت اس کے قبول کرنے پر راضی نہ ہوئے لیکن ہر مرتبہ حسرت کی دربار شاہی میں حاضری بڑے جلوا کر کے ساتھ ہوتی۔

جلد دوم سلسلۂ ذوق (حصہ اول) یعنی انتخاب دیوان ذوق، جملہ دواوین داغ۔ وشاد جگر۔
(حصہ دوم) یعنی انتخاب دواوین ......

جلد سوم سلسلۂ مومن (حصہ اول) یعنی انتخاب مومن، نسیم و تسلیم۔ (حصہ دوم) ......

جلد چہارم سلسلۂ مظہر (حصہ اول) یعنی انتخاب دیوان حسرت۔ یقین۔ حزیں۔ فاخر و بیان
شاگردان مظہر (حصہ دوم) عاشق، میر۔ درد و سوز انتخاب دواوین۔

جلد پنجم سلسلۂ جرأت مکمل یعنی انتخاب دیوان حضرت استاد جرأت۔ دیوان جرأت۔ غضنفر۔
رضا۔ رقت۔ رضوی۔ محنت۔ نصرت۔ مسرت و محبت۔ جلال و خالق شاگردان جرأت
دیوان نساخ دیوان رضا علی وحشت (یہ دیوان کہیں اور نہیں مل سکتے)

جلد ششم سلسلۂ مصحفی (حصہ اول) دیوان مصحفی مرتبہ حسرت موہانی۔ دیوان مسرور، شاگرد مصحفی
دیوان ہوس (حصہ دوم) ....

جلد ہفتم سلسلۂ آتش (حصہ اول) انتخاب دواوین ...... (حصہ دوم) انتخاب دواوین ...

جلد ہشتم سلسلۂ اسیر و امیر (حصہ اول) انتخاب دواوین ...... (حصہ دوم) انتخاب دواوین .....

جلد نہم سلسلۂ ناسخ (حصہ اول) انتخاب دواوین .... (حصہ دوم) انتخاب دواوین .....

جلد دہم سلسلۂ غالب (حصہ اول) انتخاب دواوین .... (حصہ دوم) انتخاب دواوین .....

جلد یازدہم (حصہ اول) یعنی انتخاب دواوین اساتذہ متفرق مثلاً ولی۔ آبرو۔ اختر۔ میر ممنون۔ نظم طباطبائی
(حصہ دوم) انتخاب دواوین۔

اس فہرست کو دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں دو چار ہی ایسے عالم ہوں گے جن کا مطالعہ اس قدر وسیع اور گہرا ہوگا۔

اس سلسلہ میں وہ دلچسپ واقعات مولانا بیان کرتے تھے، ایک تو طباطبائی

مرحوم کا قصہ ہے جنھوں نے اپنا غیر مطبوعہ دیوان بڑی سیر چشمی اور اعتماد کے ساتھ حسرت کے پاس انتخاب کرنے کے لئے بھیجا اور مولانا کے انتخاب پر حسرت کی اصابت رائے اور مہارت تنقید پر ایمان لے آئے۔ دوسرا واقعہ مضطر خیرآبادی سے متعلق ہے۔ انقلابا ارہویں کسی مشاعرے کے سلسلے میں حسرت اور مضطر ایک ہی جگہ مقیم ہوئے، حسرت نے ان کا قلمی دیوان دیکھنا شروع کیا کہ اس اثنا میں مضطر مرحوم کی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے آنکھ لگ گئی۔ اردوئے معلیٰ کی دوسری اشاعت میں ان کے دیوان کا انتخاب شائع ہوا اور مرحوم مضطر اس کو دیکھ کر انگشت بدندان رہ گئے۔ انتخاب کرنے کے سلسلے میں حسرت کا بیان تھا کہ ان کو سب سے زیادہ زحمت ناسخ کے دواوین کے پڑھنے میں اٹھانا پڑی، بے آب وگیاہ ریگستان تھے جن کو عبور کرنے میں ہر قدم پر ہفت خوان سر کرنا پڑتے تھے۔ فرماتے تھے ایسا استاد اور کامل فن دیکھنے میں نہیں آیا جس کے سینکڑوں اوراق پڑھنے کے بعد بھی کام کا شعر نہ ملتا تھا۔ اسی جانب ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہوئے ناسخ اور آتش کا امتیاز واضح کردیا ہے۔

"حسرت اک ریگ رواں، ایک ہو دریائے رواں
فرق یہ ناسخ و آتش کی ہے استادی میں"

سودیشی تحریک کچھ تو طبیعت کی افتاد کے باعث اور زیادہ تر ملک کی سیاسی اور اقتصادی ابتری کی وجہ سے حسرت نے شروع ہی سے سودیشی تحریک میں پورے اخلاص، اور انتہائی سرگرمی سے حصہ لیا اور اس کی تائید اور حمایت کو اپنا اولین فرض تصور کیا، ان کا خیال تھا کہ اقتصادی ترقی

ایک باافر ذریعہ ہے چنانچہ اس عقیدے کی بنا پر انھوں نے اس تحریک کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اس کو سرسبز کرنے کے لیئے انھوں نے اپنی عملی جدوجہد اس تحریک کے لیئے وقف کردی؛

"دنیا جانتی ہے کہ حسرت کا وجود اک پیکر عمل ہے۔ ان کے مذہب میں عقیدہ کا تعلق صرف قلب ہی سے نہیں ہے، بلکہ وہ اس کو ایک مرئی شکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریک کے متعلق بھی ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ جس قدر ممکن ہو اس کی وسعت تمام ہندوستان کو اپنے آغوش میں لے لے اس میدان میں سب سے پہلا قدم ان کا خود اپنے نفس اور اپنے متعلقین کی طرف بڑھا یعنی سب سے پہلے انھوں نے خود اپنے اور اپنے متعلقین کے اوپر غیر ملکی مصنوعات کو حرام کرلیا، اس کے بعد اس تحریک کو وسعت دینے میں مصروف ہوگئے۔ چنانچہ آپ کی سعی و کوشش سے کم از کم اسلامی حلقہ میں اس تحریک کو بہت کچھ ہردلعزیزی حاصل ہوئی۔۔۔۔۔۔"

(حالات حسرت صفحہ ۲۷)

اس تحریک کو مزید تقویت پہونچانے، اور اس پیغام کو عام کرنے کے لیے حسرت نے ایک سودیشی اسٹورس کی بنا ڈالی، اور فروخت کرنے کے لیئے بہت سا سودیشی سامان حاصل کرلیا، اس سلسلہ میں یہ بات فراموش نہیں کردینا چاہئے کہ حسرت کے پاس کبھی اس قدر سرمایہ نہیں ہوا کہ وہ اس اسٹور کی خریداری کے مصارف برداشت کرسکتے تھے، ان کے پاس سب کچھ تھا اخلاص تھا، علم و فضل تھا، راست بازی تھی،

خوش معاملگی تھی لیکن دولت اور سرمایہ ان سے ہمیشہ کوسوں دُور رہے، چنانچہ مولانا شبلی مرحوم کے توسل سے حسرت سر فاضل بھائی کریم بھائی تک رسائی حاصل کر سکے۔ جس کی وجہ سے ان کو سامان خرید و فروخت حاصل کرنے میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی۔ حسرت ہمیشہ سے دُھن کے پکے تھے۔ چنانچہ یہ ان کے عزم بالجزم اور عملی کدوکاوش کا نتیجہ تھا کہ ان کی دوکان چل نکلی، جس پر مولانا شبلی مرحوم نے فرمایا تھا:۔

"تم آدمی ہو، یا جن، پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنئے ہو گئے"

حسرت کی آرزو تھی کہ سودیشی تحریک ہندوستان کے طول و عرض میں مقبول ہو، ان کی خواہش تھی کہ ہر شہر اور بڑے قصبے میں متعدد سودیشی اسٹور کھولے جائیں کہ ملک کی مردہ صنعتیں کچھ فروغ حاصل کر سکیں، چنانچہ اس تحریک کو مزید تقویت پہونچانے، اور اس کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے حسرت نے شمالی ہند کا ایک وسیع دورہ کیا اور جا بجا تجار اور قومی افراد سے مل کر اس تحریک کے گوناگوں فوائد سے ان کو آگاہ کیا، حسرت کے لباس میں ہمیشہ وہ سادگی موجود رہی جو شاید بڑے سے بڑے سودیشی تحریک کے حامی کے ہاں مشکل سے نظر آئے گی، انکا لباس، اور ان کی سج دھج دیکھ کر یہ کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس قدر بلند پایہ "شاعر غزل، اور ادب دانِ بلیغ" ہو سکتے تھے۔ بر صہ تک مسٹن روڈ پر ان کا خلافت اسٹور لشٹیڈ جاری رہا اور مولانا سودیشی کپڑے مدتوں خرید و فروخت کرتے رہے حسرت کو بار بار قیدِ فرنگ کے مصائب میں مبتلا ہونا پڑا، اور نہ ان کا کاروبار ان کی دیانت اور محنت کے باعث یقیناً سرسبز ہوتا، اور وہ فکرِ معاش سے بہت بڑی

حد تک بے نیاز ہوتے، ورثہ میں مولانا کو جو جائداد ملی تھی اس کا ایک حصہ اپنے جد حضرت سید شاہ وجیہہ کے مزار کے نام وقف کرچکے تھے اور ایک حصہ اپنے مرشد حضرت مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی کے عرس کے لئے اور بقیہ کا منافع ان کی پہلی صاحبزادی بذریعہ وقف علی الاولاد (اہلیہ صاحبہ سید عبدالسمیع صاحب) کو ملتا رہتا ہے، حسرت خود اس سے متمتع نہیں ہوتے تھے جب تک حسرت کی پہلی بیوی (مرحومہ بیگم حسرت موہانی جو ہندوستان کی سیاسی اور ادبی دنیا میں ایک مشہور اور نیک نام خاتون تھیں[1]) زندہ رہیں حسرت اپنے اسٹورس کے کاروبار اور خانہ داری کی الجھنوں سے ہمیشہ آزاد رہے، چنانچہ حسرت ہمیشہ مرحومہ کو بڑی محبت، اور حقیقی تڑپ کے ساتھ یاد کرتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی اور حسرت تعلیمات کا میدان گو حسرت کی سیاسی جدوجہد سے اکثر دور رہا لیکن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے بارے

لہ مرحومہ بیگم حسرت موہانی کے صرف ایک اولاد ہوئی، اُن صاحبزادی کا نام نعیمہ بیگم ہے، ان کو مرحومہ بہت عزیز رکھتی تھیں، جب ان کی شادی کے بعد ان کی اولاد ہوئی تو یہ بچے مرحومہ کے لخت جگر بنے، ان کے بڑے لڑکے سید رضوان الحسن کو مرحومہ نے گود لے لیا تھا، چنانچہ حسرت اس وضع پر قائم رہے اور اپنی صاحبزادی اور نواسے سے معمول سے زیادہ مانوس تھے، اور پوری توجہ اور محبت کے ساتھ حتی الوسع ان کے نگراں حال رہتے تھے (قطعہ تاریخ پیدائش سید رضوان الحسن پسر عبدالسمیع موہانی و نعیمہ بیگم بنت حسرت موہانی)۔

حق نے بیٹا جو نعیمہ کو دیا	میرا فرزند وہ روحانی ہے
سال پیدائش رضواں حسرت	ثانی حسرت موہانی ہے

۱۳۴۱ھ

میں حسرت کا نظریہ قابلِ ذکر ہے: "اس سلسلہ میں انھوں نے قوم کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، اور عام جذبات کے احترام کرنے پر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو انھوں نے بارہا مجبور کیا ہے۔" حسرت ثانوی تعلیم کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمان صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت میں شریک ہوں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ جا بجا مسلم اسکول اور کالج کھولے جائیں اور ان کا الحاق علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے ہو سکے۔ اس خیال کی بنا پر وہ اسکولوں کے الحاق کے حق کے بغیر مسلم یونیورسٹی کو زیادہ مفید نہیں سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، زمانہ بہت آگے نکل آیا ہے اور قوم کے سامنے نئے نئے مسائل موجود ہیں جو قوم کی توجہ اپنی جانب منعطف کئے ہوئے ہیں، لیکن ۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ قوم کے پیش نظر تھا، اور اکابر قوم کی ایک بڑی جماعت کی کوشش یہ تھی کہ جب تک آزاد یونیورسٹی نہ ملے تب تک یونیورسٹی کے چارٹر کو قبول کرنا ایک فعل عبث ہے[1]۔ حسرت آزاد یونیورسٹی کے حامی تھے اور آخر وقت تک اپنے خیال اور عقیدے کی بنا پر سرگرم عمل رہے، مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی حسرت کے ہم خیال تھے، لیکن اسی زمانہ میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے

---

[1] حسرت نے اس خیال کو اس رباعی میں ظاہر کیا ہے ؎

ارباب فریب کی ہے یہ بھی اک چال — بیکار ہے "بہترین و بہتر کا خیال"
گنجائش بہتری غلامی میں کہاں — لاریب ہے اجتماع ضدین محال

کہ یہ دونوں بزرگانِ قوم نظر بند کردیے گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود حسرت کو میدان میں اتر آنا پڑا، لکھنؤ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا تھا۔ حسرت نے بہت جلد یہ محسوس کیا کہ ان دونوں حضرات کی عدم موجودگی میں احرار کی تائید کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی چنانچہ انھوں نے مختلف مقامات کا دورہ کیا، اور بہت سے اصحاب کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس جلسہ میں شریک ہوں، جلسہ میں بہت گرما گرمی رہی، اور جب تک حسرت آزاد رہے اس وقت تک مخالف جماعت اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکی، حسرت کی نظر بندی کے بعد سیاسی فضا کچھ سے کچھ ہو گئی، جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی، اور سرزمین ہند میں نئی نئی سیاسی اور معاشرتی تحریکیں نمودار ہونے لگی تھیں مسلمان پریشان حال تھے، چاروناچار اکابر قوم کو وہی یونیورسٹی کا چارٹر منظور کرنا پڑا جو حکومت دینے پر آمادہ تھی، لیکن حسرت اپنے عقیدہ پر بدستور قائم تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

گو بظاہر شیر ہوں، باطن میں بودے دل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں

فوج کو اپنی ہی دینا ہے کے دشمن سے شکست
یہ نتیجے آپ ہی کی فکر لا طائل کے ہیں

ناز تھا شوقِ شہادت پر ابھی کل تک جنھیں
دست و بازو آج گویا خود ہی قاتل کے ہیں

مل چکی سرکار استبداد میں جائے اِنام

حوصلے بیکار اس تجویز بے حاصل کے ہیں

پائیں گے البتہ آغا خان ثانی کا خطاب
گر یہی انداز اُن کی فہم نا قابل کے ہیں

شہرۂ انصاف مظہر نے یہ ثابت کر دیا
ہم میں اب بھی کچھ نمونے ناظم و کامل کے ہیں

کیوں نہ ہو خطرے میں حسرت قافلہ احرار کا
راہزن ہوں جب وہی جو راہبر منزل کے ہیں

اس غزل سے جہاں حسرت کے جذبات، اور احرار کے نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حسرت اپنے خیالات کے بیان کرنے میں بیباک رہے اور وجاہت، دولت، اقتدار کے بلند سے بلند مظاہر سے وہ کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ چنانچہ وہ صرف گاندھی اور جناح بلکہ حکومت کے طرز عمل کی بھی بے لاگ تنقید کرنے میں تامل نہیں کرتے تھے بیباکی اور یہ جرأت رندانہ حسرت کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔

حسرت کی سیاست موجودہ سیاسی معتقدات پر حسرت سے سوال کیا گیا، جواب ملا کہ آزادئ کامل میرا نصب العین ہے اور میں کمیونسٹ[1] ہوں، پہلے نیشنلسٹ

---

[1] ملاحظہ ہو۔ نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی — نہ حکام کا جورِ بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں — کسی کا نہ حجت یہ دعویٰ رہے گا
دستور کے اصول مسلّم ٹھہر چکے — شاہی بھی رام غلبۂ جمہور ہو چکی
سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں کیوں نہ ہوں — محکوم سب کو قوت کا مژدہ ہو چکی

تھا لیکن ۱۹۲۵ء سے میں نے نیشنلزم کو خیرباد کہا اور کمیونزم کو اپنا مسلک قرار دیا،
چنانچہ مولانا کے پرچہ مستقل کے فائل دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے برسوں
کمیونزم کے خیالات اور عقائد ہندوستان میں پھیلائے، اور اُن غلط فہمیوں کا ازالہ
کرتے رہے، جو ہندوستان میں کمیونزم کے خلاف اکثر و بیشتر پھیلتی رہیں،
اردوئے معلّٰی بابتہ مئی و جون ۱۹۳۶ء میں "روس میں نئی پود کی ترقی" "سوشلزم"
اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب "سوشلزم کیا چاہتا ہے؟" "اسلام اور سوشلزم"
"چینی مسلمان اور کمیونسٹ اقتدار" اُردوئے معلّٰی بابتہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۳۶ء
میں پنڈت نہرو اور سوشلزم" کے مضامین شائع ہوئے اور پرچے دیکھنے سے
پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں اس ہی قسم کے مضامین حسرتؔ کے قلم سے نکلے اور
تقریر و تحریر کے ذریعہ ان ہی خیالات کا پرچار ہوتا رہا۔ چنانچہ آل انڈیا کمیونسٹ
کانفرنس جو ۱۹۲۵ء میں بمقام کانپور منعقد ہوئی تھی اس کے روح رواں اور صدر
حسرتؔ ہی تھے۔ اس موقعہ پر آپ نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا وہ ہند
اور بیرون ہند کی اشتراکی جماعتوں نے بڑی قدر و منزلت سے دیکھا۔ حسرتؔ
سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن ہند کی مکمل آزادی کو معرض خطر میں نہیں دیکھ
سکتے تھے، کامل آزادی، ان کا دین و ایمان تھی اور جب کوئی سیاسی قائد
سیاست کے میدان میں آکر کامل آزادی کے معاملہ میں سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوتا
تھا مولانا بڑی جرأت اور درشتی کے ساتھ اس کو وہیں للکارتے تھے۔ ۷ر دسمبر
۱۹۲۹ء کے مستقل میں گاندھی اور جواہر لال نہرو پر ان الفاظ میں لے دے کی ہے۔

"لاہور کانگریس کے صدر منتخب ہندوستان کے مشہور حریت نواز اور

نوجوان لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی آخر کار کچھ تو اپنی فطری
وآبائی اعتدال پسندی کی بنا پر، اور کچھ مہاتما گاندھی کے عیارانہ
پندو نصیحت سے مسحور ہو کر لارڈ ارون کے تحفۂ غلامی کو ہدیۂ حریت
قرار دے کر بدل و جان منظور کر لیا، اور ہمارے اس قول کی
عملی طور پر تصدیق کر دی کہ اس وقت طول و عرض ہند میں
بعض کمیونسٹ نوجوانوں کو چھوڑ کر باقی ایک ہندو بھی ایسا
موجود نہیں ہے جو واقعی دل سے ہندوستان کے لئے آزادی
کامل کا خواہاں ہو.......... حریت کے سب سے
بڑے مدعی جواہر لال نہرو کا خاتمہ اس طور پر ہوا، اب مہاتما
گاندھی کی روداد سنئے، یہ بزرگوار یہی نہیں کہ غلامی کو سوراج
تسلیم کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں، بلکہ اس غلامی کو بھی
صرف اس حال میں قبول کرنا چاہتے ہیں جبکہ اس کی صورت
نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق ہو........"

اردوئے معلیٰ بابتہ ماہ جولائی و اگست ۳۱ء میں حسرت کا خطبۂ صدارت شائع
ہوا تھا جس کی چند سطریں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ اس موقعہ پر حسرت جمعیۃ علمائے
صوبۂ متحدہ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد مورخہ ۸، ۹ اگست ۳۱ء کے صدر تھے۔

"غرضکہ جمعیۃ علماء دہلی آزادی کامل کے نصب العین سے
دست بردار ہو کر فنا ہو چکی، مگر الحمد للہ کہ علمائے کانپور، لکھنؤ
و بدایوں وغیرہم کی جماعت اب بھی اپنے عہد پر قائم ہے اور

انشاء اللہ تعالیٰ قائم رہے گی بعض معترضین پست حوصلہ کی جانب سے اس اعلیٰ نصب العین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب فی الحال وہاں تک پہونچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو پھر اس کا ذکر ہی بیکار ہے، ہم کہتے ہیں کہ ذکر تو بیکار نہیں بلکہ بہت ضروری ہے اس لئے اگر نصب العین ہر وقت پیشِ نظر نہ رہے تو اس کے فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے ......

ڈومینین اسٹیٹس کی بہر حال مخالفت کرنا چاہیئے اس لئے کہ یہ شے ہمارے مقصود یعنی آزادیٔ کامل کی درمیانی منزل یا اس کا جز نہیں بلکہ اس کے منافی اور متقابل واقع ہوئی ہے، اگر گاندھی جی ولایت پہونچ گئے، گول میز کانفرنس کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی اور ہندوستان کو درجۂ نو آبادیات مع تحفظات یا بلا تحفظات کسی طرح کا بھی مل گیا تو آزادیٔ کامل کا تخیل ختم یا ایک عرصہ دراز تک کے لئے خواب و خیال ہو جائے گا ......"

حسرت کی سیاست ان دو عناصر سے تعمیر ہوئی تھی، کامل آزادی، اور اشتراکیت، چنانچہ سوال کرنے پر ارشاد فرمایا کہ میں پاکستان[1] کا مؤید ہوں، لیکن پاکستان

---

[1] حسرت نے ۲ مرتبہ یورپ کا سفر کیا تھا اور سوائے ٹرکی اور روس کے اکثر ممالک دیکھے تھے انگلستان کے قیام کے دوران میں وہاں کے بڑے بڑے سیاسیین سے ملے مثلاً لارڈ زٹ لینڈ، کرنل ویجوڈ ان سے ہندوستان کے لئے نوٹیشن تھیوری پر مفصل گفتگو کی اور ایوان عامہ کے اراکین کی مجلس میں تین گھنٹے تک ہندوستان کے سیاسی مطالبات پر مفصل تقریر کی۔ یہ ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔ حسرت کا خیال تھا کہ سیاسی حیثیت سے یہ سفر کامیاب رہا۔

ڈومینین کا قائل نہیں بلکہ پاکستان جمہوریت کا علمبردار ہوں۔ اور یہی نکتہ میرے اور قائد اعظم کے درمیان ایک خلیج پیدا کر رہا ہے۔

حسرت نے اپنے نظریہ کو اس صورت میں واضح کیا۔ انکا خیال تھا کہ ہندوستان میں پانچ (REPUBLICS) جمہوریہ قائم ہونا چاہیئے جنکی تفصیل یہ ہے:-

(۱) مشرقی پاکستان

(۲) مغربی پاکستان

(۳) مرکزی ہندوستان

(۴) جنوب مشرقی ہندوستان

(۵) جنوب مغربی ہندوستان

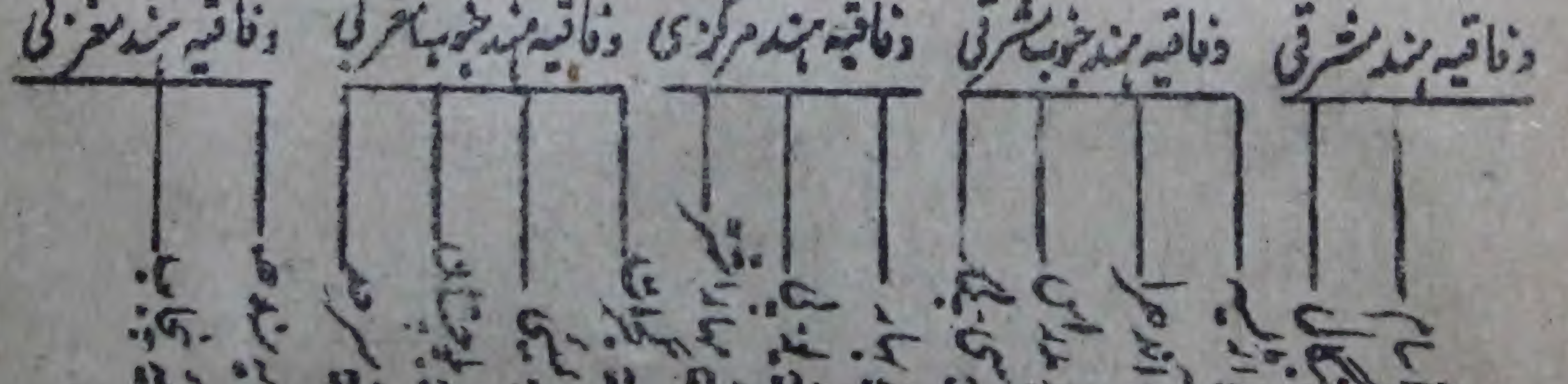
اور

(۶) حیدر آباد

ان سب کو وفاقی اتحاد ریاست ہائے ہند کا اجزائے ترکیبی ہونا چاہئے۔ اسکی مکمل تشریح یہ ہے:-

"حسرت موہانی کا مجوزہ دستور اتحادیہ وفاقیات ہند"

مع کابینہ ترکیبیہ ہند مستقر دہلی



CONFEDERAL ۔۔۔ UNION

SOVEREIGN STATE ۔۔۔ FEDERAL

بہ شرائط ذیل

(۱) ترکیبیہ ہند کا حق ہوگا کہ جن آزاد حکومتوں یا جمہوریتوں مثل برطانیہ، روس یا چین سے چاہے معاہدہ دوستی یا غیر جانبداری کرے نیز صلح و جنگ کا بھی اعلان کر سکے۔

(۲) ترکیبیہ ہند میں بغرض اشتراک عمل ہر وفاقیہ ہندوستان برابر تعداد میں اپنے نمائندے بذریعہ انتخاب بھیجے۔

(۳) ہر جمہوریہ وفاقیہ کو اپنا اپنا گورنر یا گورنر جنرل انتخاب کرنے پر نیز اپنے ایوان ہائے قانون کے انتخاب کا حق ہوگا۔

(۴) ہر جمہوریہ وفاقیہ کے انتخاب میں حق رائے کل آزاد بالغوں کو حاصل رہیگا اور پارٹیاں صرف سیاسی بن سکیں گی اور یہ شرط لازمی طور پر درج دستور ہوگی کہ اگر ایک رائے بھی صریحاً فرقہ یا مذہب کی بنا پر حاصل کی جائیگی تو بشرط ثبوت وہ انتخاب کالعدم ہو جائے گا۔

(۵) سیاسی پارٹیوں کی صحیح تشکیل کے لئے مالدار (CAPITALIST) اور نادار (NATIONALIST) پارٹیوں کی طرح کامدار پارٹی (SOCIALIST) بھی جائز سمجھی جائے گی اور خلاف قانون نہ قرار دی جا سکے گی

(۶) ترکیبیہ کے صدر کا انتخاب براہ راست کل باشندگان ترکیبیہ کی رائے سے ہوگا اور اس کا دائرہ عمل مسائل مفوضہ تک محدود رہے گا۔ وفاقیہ ریاستیں خود مختار ہوں گی اور باقی معاملات میں ترکیبیہ کے ماتحت نہ ہوں گی۔

(۷) اسی طرح وفاقیہ کے صدر کا انتخاب بھی براہِ راست کل بالغان وفاقیہ کی رائے سے ہوگا، اور اس کا دائرہ عمل مسائل مفوضہ تک محدود رہے گا۔ باقی معاملات میں جمہوریتیں خود مختار ہوں گی وفاقیہ کے ماتحت نہ ہوں گی۔

(۸) اگر حکومت برطانیہ اس مجوزہ دستور کو منظور اور اس کے فوری قیام کو تسلیم کرلے گی، تو موجودہ صوبجات ہند کے یوروپین گورنر مجوزہ جمہوریتوں کے گورنر اور ہندوستان کے موجودہ گورنر جنرل کابینہ ترکیبیہ ہند کے عارضی پریذیڈنٹ مان لئے جائیں گے۔ اور دوران جنگ میں ہندوستان کی کل فوج اور وسائل ان کے اور موجودہ کمانڈر انچیف کے ماتحت کام میں لائے جاسکیں گے البتہ جنگ کے کامیاب خاتمے پر اہل ہند باضابطہ طور پر اپنے گورنر اور کل ہند کا پریذیڈنٹ منتخب کرلیں گے۔

(۹) ہندوستان کی موجودہ دیسی ریاستوں میں سے جو اور جب ایک وفاقیہ آزاد کا درجہ حاصل کرلیں مثلاً حیدرآباد و برار وہ بھی آئندہ اس ترکیبیہ نظام میں شامل ہوسکتی ہیں۔

(۱۰) باقی ایسی ریاستیں بھی بشرط حصول آزادی و جمہوریت اپنی اپنی جگہ حسب حیثیت و اہمیت وفاقیہ نظام حکومت یا جمہوریہ نظام حکومت میں شامل ہوسکتی ہیں۔

(اردوئے معلی بابتہ جنوری۔ فروری مارچ ۴۲ء)

حسرت کی سیاست کے بارے میں ہماری گفتگو ناتمام رہے گی، اگر ہم ناظرین کو یہ نہ بتائیں کہ حسرت کے سیاسی کردار کو سب سے زیادہ استحکام تلک کی سیاست سے

پہونچا۔ چالیس سال تک حسرت ہندوستان کے سیاسی میدان میں نبرد آزما رہے، چنانچہ بہت کم ایسے سیاسی قائدین ہوں گے جن کی حقیقت اور جن کے کردار سے مولانا واقف نہ تھے۔ سب کو دیکھ چکے، آزما چکے، جانچ چکے، ایک مرتبہ نہیں بلکہ سینکڑوں مرتبہ اس تجربے کے بعد ان کے دل میں سب سے زیادہ تلک مرحوم کی عزت تھی اور ہمیشہ آنجہانی کا نام حسرت بڑے احترام اور عقیدت سے لیتے تھے۔ فرماتے تھے "اس سے زیادہ مخلص اور نڈر آدمی اب تک نہیں دیکھا" چنانچہ اپنے اشعار میں جا بجا تلک کو محبت اور عزت کے ساتھ یاد کیا ہے۔

معلوم نہ ہو خاطرِ حسرت کہ تلک تک
پیغامِ وفا بادِ سحر لے کے گئی ہے

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں، بپا دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک، مہراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک

جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دلوں پہ زور ان کا
اب رہ کے بہشت میں نزد خدا، روحوں پہ کریں گے راج تلک

ہر ہندو کا مضبوط ہے جی، گیتا کی یہ بات ہے دل پہ لکھی
آخر میں جو خود بھی کہا ہے، یہی پھر آئیں گے مہراج تلک

یہ اشعار تو حسرت نے تلک کے سرگباشی ہونے کے موقعہ پر لکھے تھے جب سارے ہندوستان میں ان کی وفات پر ماتم کیا جارہا تھا، لیکن پُرخلوص عقیدت کا اگر صحیح جذبہ دیکھنا ہو تو یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبّ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقیں و حق سخن
تجھ سے قائم ہو بنا آزادیٔ بے باک کی
تجھ سے روشن اہلِ اخلاص و صفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزندِ ہند
خدمتِ ہندوستاں میں کلفتِ قید و محن
ذات تیری رہنمائے راہِ آزادی ہوئی
تھے گرفتارِ غلامی ورنہ یارانِ وطن
تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسمِ کہن
ناز تیری پیروی پہ حسرتِ آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربِ ذوالمنن

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ تلک سے حسرت کا بہت گہرا دوستانہ تھا۔
سیاست کے ماہر کی حیثیت سے حسرت بالکل عملی تھے جس طرح ان کی شاعری لب کی بوسے قطعاً منزہ ہے اور فلسفہ کی گہرائی سے دور ہے اسی طرح ان کی سیاست داؤں پیچ اور ڈپلومیسی کی اونچ نیچ سے بلند تر تھی۔ گاندھی کے فلسفہ اہنسا کے بارے میں ان کا پختہ یقین تھا۔

"جسے کہتے ہیں اہنسا اک اصولِ خودکشی تھا
عمل اُس پہ کوئی کرتا نہ کبھی عوام کرتے"

حالانکہ ایک زمانہ میں جسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہندوستان کا سیاسی فلسفہ اسی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، مگر حسرت پوری وضاحت اور تقویت کے ساتھ اپنے خیال کا برملا اظہار کرتے تھے، اسی خیال کے متصل حسرت نے اپنی سیاسی زندگی کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

ہے تحریک حریت کو جو پایا قرینِ حق
ہر عہد میں معاونِ تحریک ہم رہے

ان کی سیاسی آرزو کا اس سے پتہ چلتا ہے :-

"جو فیض عشق یہی ہے تو کیا عجب حسرت
کہ امتیاز نہ کچھ شیخ و برہمن میں رہے

پھر یہ بھی ارشاد ہوتا ہے :-

"قوموں کی ترقی کے ہیں کچھ اور ہی اسباب
جو ڈاک پہ موقوف نہ ہیں تار پہ موقوف"

آگے چل کر یہ ارشاد بھی موجود ہے :-

"قوت کی جو پوچھو تو یہ ہوتی ہے ہمیشہ
اقوام میں افراد کے ایثار پہ موقوف"

اور دین کی پستی کے ساتھ ساتھ ہند کی تباہی یکساں قوت کے ساتھ حسرت کے دل کو مجروح کئے ہوئے تھی۔

فرماتے ہیں :-

مجھ سے اب دین کی پستی نہیں دیکھی جاتی	غلبۂ کفر سے بیزار ہوں شیئاً للہ
پائے رفتن ہے نہ ہے ہند میں جائے ماندن	سخت مشکل میں گرفتار ہوں شیئاً للہ

حسرت کا مذہب حسرت کے مذہبی عقائد کیا تھے؟ ان کا دین و ایمان کیا تھا؟ یہ سوالات جس قدر ضروری ہیں اسی قدر دلچسپ اور اہم بھی ہیں۔ سوال کرنے پر حسرت نے ارشاد فرمایا کہ میں قدامت پرست سنی اور صوفی ہوں، اس موقعہ پر حسرت نے (CONSERVATIVE) کا لفظ

استعمال کیا تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے الجھیڑوں سے بلند تر ہیں،
چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

حنفی ہیں، نہ مالکی، نہ ہمیں حنبلی سے نہ شافعی سے غرض
ہم کہ خالص ہیں پیروِ اسلام اور رکھتے نہیں کسی سے غرض

ہندوستان میں اسلام نے جو مسخ صورت اختیار کی ہے اس کے بارے میں حسرت کا خیال ہے۔

کشورِ ہند کہ مغلوب رہا ہے، اس میں
نام ہی نام ہے اسلام کا اسلام کہاں؟

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ حسرت اسلام کی صحیح تعلیم، اور مذہب کے سچے جوہر سے واقف تھے، فرماتے ہیں کہ میرے عقائد کی دو مستحکم بنیادیں ہیں۔

"العشق ہو اللہ والحسن ہو الحق" اور
"دل بہ یار دوست بکار"

میں تصوف کو مذہب کا جوہر سمجھتا ہوں، اور تصوف کا ماحصل میرے نزدیک جذبۂ عشق ہے۔

"تعلق حسن و حق" میں بھی ہے "العشق" و "ہو اللہ" کا
یہی تو اصل دین و رمزِ پنہاں تصوف ہے

اس سلسلہ میں خود حسرت کا نوٹ یہ ہے:۔
"یعنی "العشق ہو اللہ[۱] کی طرح "الحسن ہو الحق" بھی رموز تصوف میں سے ہے"

۱؎ ہر لحظہ وظیفہ ہے جان و دلِ آگہ کا
"الحسن ہو الحق" کا "العشق ہو اللہ" کا (حسرت)

اور اپنے اشعارِ عشقِ مجاز کو اس طرح واضح کیا ہے :۔

"میرے عشق مجاز کا ہے شعار
فی الشغل دل بیار و دوست بکار"

عمر کے آخری حصے میں سیاسی جد و جہد سے گزر کر حسرت کہتے ہیں :۔

"کوراج" "سوراج" سب بھول کے حسرت
اب مانگت "پریم" راج

پریم کی لگن، عشق کا جذبہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حسرت کے کلام میں مجاز سے گزر کر حقیقت کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔ ہمارے پیشِ نظر حسرت کے بارہ دیوان ہیں پہلے دو دواوین میں،

دیکھئے اب رنگ کیا لائے وہ حُسن دلفریب
آئینہ پیشِ نظر ہے ہاتھ میں ہے شانہ آج

اور

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں
اس درجہ اعتبارِ تمنّا نہ چاہئے

کا رنگ موجود ہے، اور آخری دو دواوین میں تصوّف اور معرفت کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔

مذہب عشق میں ناکامی جاوید کی خو
فرض، منجملہ، احکام عبادت، ہوئی

اسی کا جلوہ ہر جانب عیاں ہے نمودِ حُسن بے صورت کہاں ہے

حسرت کا تصوف

"حالات حسرت" میں مذکور ہے:۔

"مذہبًا مولانا حنفی تھے اور مشربًا قادری، اور اس خانوادہ کے رکن اوّل و اعلیٰ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی عقیدت اور ارادت عشق کے درجہ پر پہونچی۔ جس کا اظہار متعدد غزلوں میں آپ نے کیا ہے، مثلاً ایک پوری غزل حضرت غوث پاک کے متعلق فرماتے ہیں:۔

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للہ میر بغداد میں ناچار ہوں شیئاً للہ
حال دل شرم سے اب تک نہ کہا تھا لیکن آج میں درپئے اظہار ہوں شیئاً للہ
کرم خاص کے لائق تو نہیں میں پھر بھی آپ کا غاشیہ بردار ہوں شیئاً للہ
آپ ہی سُنئے کہ اب اور کہوں میں کس سے
بستۂ دامن سرکار ہوں شیئاً للہ

حسرت بچپن ہی سے مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی کے زمرۂ ارادت مندا[ن] میں داخل ہوگئے تھے۔ اس کے بعد ان کے فرزند و جانشین حضرت مولا[نا] عبدالوہاب صاحب سے تجدید بیعت کی، یہ سلسلہ، سلسلۂ قادریہ ہے سے

غرض حسرت کو وہاب، عبدرزاقین دوالی سے
ملا کر، مرتبہ انوار کا دو یا رسول اللہ

اس کی تشریح حسرت نے یوں کی ہے:۔
(۱) حضرت سید عبدالصمد خدا نما احمد آبادی مرشد حضرت سید عبدالرزاق بالسو[ی]

(۲) مرشدی حضرت شاہ عبدالوہاب لکھنوی فرنگی محلی

(۳) حضرت شاہ عبدالرزاق لکھنوی فرنگی محلی و حضرت سید عبدالرزاق بانسویؒ۔

(۴) حضرت شاہ عبدالولی لکھنوی فرنگی محلی۔

(۵) حضرت مولانا انوار لکھنوی فرنگی محلی جن کا باغ انوار، لکھنؤ محلہ رکاب گنج میں مشہور عام ہے۔

(۶) تصوف کا رنگ شروع ہی سے اسقدر گہرا ہے کہ بار بار ان ہی خیالات کا اعادہ ہوتا ہے۔

گرہانِ وصالِ یار کریں — جاکے بلتنے میں راہبر کی تلاش
شمس رومی سے پوچھ لیں ہو جنھیں — سخنِ عشق معتبر کی تلاش

مجھے فیضِ سخن پہونچا ہے حسرت — ز روحِ پاک شمس الدین تبریز

جولائی ۱۹۱۶ء[1] میں مولانا فیض آباد جیل سے لکھنؤ سنٹرل جیل منتقل کیے گئے اسوقت

[1] حسرت کو تین مرتبہ قید فرنگ کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

(۱) تلک مرحوم کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۹۰۸ء میں دو سال کی قید بامشقت ہوئی

(۲) ۱۹۱۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا نثار احمد کیساتھ دو سال کے لئے قید ہوئے۔ اور یو۔پی کے اکثر جیل خانوں میں رکھے گئے۔

(۳) ۱۹۲۲ء میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس الہ آباد میں ہوئے تھے مولانا زیر دفعہ ۱۲۴ الف ماخوذ ہوئے اور ۲ سال کی سزا دی گئی۔ مگر ۲ سال بعد رہا کر دیے گئے۔

مولانا نے قید کو چاہے بامشقت ہو نظر بندی پر ہمیشہ ترجیح دی۔

آپ "آستانِ شاہ رزاق" کے بالکل متصل آ گئے تھے، اس کا حوالہ ان اشعار میں موجود ہے جن سے مکیف اور سچے جذبات عقیدت و محبت ظاہر ہوتے ہیں ؎

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہونچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب
لکھنؤ آنے کا باعث یہ کھلا آخر کار
کھینچ لایا ہے دل اک شاہدِ پنہاں کے قریب
وہ جو ہیں پاس تو مجلس بھی ہے اک باغ ہمیں
کامرانی بھی نمودار ہے حرماں کے قریب
روز ہو جاتی ہے دو پایں زیارت حسرت
آستانِ شہِ رزاق ہے زنداں کے قریب

چلی سابرمتی میں آج کیا ہے ۔۔۔ نسیم رحمت و فضل الٰہی
جمالِ التفات شاہ جیلاںؒ ۔۔۔ ہوا پیدا بشانِ کج کلاہی
بیک دم دید یا دینا تھا جو کچھ ۔۔۔ دکھا دی شانِ حسنِ کم نگاہی
شہ عبد الصمد کا واسطہ تھا ۔۔۔ نہ کیوں کر سرِّ حق کھلتا کماہی
دلِ حسرت ہوا معمورِ انوار
شہِ رزاق دیتے ہیں گواہی

عشق مرشد بڑھتے بڑھتے عشق رسول اللہ تک پہونچا، اور ناظرین کو سُن کر تعجب ہوگا

کہ سرمایہ کے فقدان کے باوجود حسرتؔ گیارہ حج کر چکے تھے اور ایک مرتبہ خشکی کے راستہ سے خانہ کعبہ تشریف لے گئے تھے جس میں سفر کی بہت سی صعوبتیں اٹھانا پڑیں مگر بصرہ۔ بغداد۔ کاظمین۔ کربلائے معلیٰ۔ نجف اشرف، سب کی زیارات سے مشرف ہو کر تزکیہ نفس اور تصفیہ روح کر سکے، چنانچہ آخری دور کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ مدینہ۔ شاہِ مدینہ۔ مزارِ مدینہ اور گنبدِ خضرا کی جانب تکرار کے ساتھ اشارے پائے جاتے ہیں۔

پھر آنے لگیں شہر محبت کی ہوائیں
پھر پیش نظر ہو گئیں جنت کی فضائیں
اے قافلہ والو، کہیں وہ گنبدِ خضرا
پھر آئے نظر ہم کو کہ تم کو بھی دکھائیں
ہاتھ آئے اگر خاک ترے نقش قدم کی
سر پر کبھی رکھیں کبھی آنکھوں سے لگائیں

فنا ہے بقا مسلکِ عاشقی میں
اگر رو نما ہو دیارِ نبیؐ میں؟
سفر جب نہ ہو پھر مدینہ سے حسرتؔ
وہ کب آئیں گے دن تری زندگی میں

کھنچ گئی نورِ علیٰ نور کی تصویر جمیل
بعد کعبے کے جو آنکھوں نے مدینہ دیکھا

مشربِ تصوف کے سلسلہ میں گفتگو ہو گئی۔ دوران گفتگو میں حسرتؔ نے ایک نہایت عجیب نکتہ بیان فرمایا۔ ان کے نزدیک صداقت اور حسن میں کوئی فرق نہیں ہے، اور چونکہ ہندو دیوتا سری کرشن حسن کا اوتار مانے جاتے ہیں۔ اس لئے حسرتؔ کو بھی کرشن سے سچی عقیدت تھی اور وہ ایک سچے عقیدت مند کی

حیثیت سے متھرا اور بندرابن جاتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس سفر سے ان کو روحانی فیض حاصل ہوتا ہے حسرت کہتے تھے کہ گیتا میں دیراگ اور تیاگ پر زور نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ سری کرشن عمل یعنی کرم یوگ کے فلسفہ کی تبلیغ کرتے تھے، اس لئے ان کے نزدیک اسلام، اور گیتا کی تعلیمات میں جا بجا یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں سری کرشن عشق اور حسن کے اوتار تھے، اس لئے بعض اہل باطن اور صوفیائے کرام سری کرشن کو ولی مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ تھا کہ ان کا روحانی تصرف ہندوستان میں جاری وساری ہے۔ دیوان ہفتم مرتبہ بیگم حسرت موہانی کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:۔

"جن جن بزرگوں سے فقیر کو فیض پہونچا ہے ان میں سے اکثر کی جانب اس مجموعہ میں کہیں نہ کہیں اشارہ موجود ہے۔ بزرگانِ دینِ اسلام کے علاوہ ایک موقع پر سری کرشن کا بھی نام آیا ہے۔ حضرت سری کرشن علیہ الرحمۃ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر حضرت سیّد عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہٗ کے مسلکِ عاشقی کا پیرو رہا ہے۔

مسلک عشق ہے پرستش حسن
ہم نہیں جانتے عذاب و ثواب"

ملاحظہ ہو:۔

متھرا سے اہل دل کو وہ آتی ہے بوئے انس — دنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا
لبریز نور ہے دل حسرت نہ ہے نصیب — اک حسن مشک فام کے شوق تمام کا

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
پیغام حیات جاوداں کا ہر نغمہ کرشن بانسری کا
وہ نور سیاہ تھا کہ حسرت
سرچشمہ فروغ آگہی کا

اور اس نظریہ کی تائید اس طرح کی گئی ہے :۔

حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورتِ حق کا
گو اُس کی نظر شیفتہ حسنِ بتاں ہے

من توسے پریت لگائی کنہائی کاہو اور کی سرت اب کاہے کو آئی
گوکل ڈھونڈ بندرابن ڈھونڈ برسانے لگ گھوم کے آئی
تن من دھن سب وار کے حسرت متھرا نگر چل دھونی رمائی"

تزکیہ نفس کے حاصل کرنے کے لئے چند اور مفید اشارے حسرت کی کلیات میں موجود ہیں ۔

عقدہ وصالِ یار کا حل ہو تو جانئے
خوف و خلوص و علم و عمل ہو تو جانئے

ایک جگہ اور ارشاد ہوتا ہے :۔

ہم ہیں بیمار کبر و عجب و ریا کیوں نہ درکار ہو دوائے خلوص
طے کرائے دل بہ زور علم و عمل راہ بیم و رجا بپائے خلوص
زہد و تقوے ریاضت و عزت بن گئے جبکہ دستِ ویائے خلوص

نفسِ شیطانؔ و خلقتؔ و دنیاؔ — سب پہ غالب ہوئی دعائے خلوص

دل کا تقویٰ ہو خیر خواہی خلق — ہو بشرطیکہ بر بنائے خلوص
فکر رزق و مصائب تقدیر — عارضِ حال تھے بجائے خلوص
سو بہ صبرؔ و توکلؔ و تفویضؔ — بن گئے شیوۂ رضائے خلوص
توبہؔ و علمؔ و حمدؔ و شکرہیں باب — شہر ہے شہر پر فضائے خلوص
ذکرؔ و فکرؔ و ریاضؔ و صومؔ و صلوٰۃؔ — سارے جھگڑے ہیں اک برائے خلوص
اور حقیقت میں ان کے سب کے سوا — عشق ہے اصل مدعائے خلوص

اس تمام گفتگو کے بعد حسرت کا یہ کہنا ہے :-

"ولایت کا دعویٰ نہیں مجھ کو لیکن
ہے اتنا کہ ہوں اک گنہگار صالح"

بجائے خود تصوف کا کوئی رمز ہے جو صرف اہلِ بصیرت ہی شاید سمجھ سکتے ہیں۔

حسرت کی ایک پرانی غزل ہے۔

کیوں نہ مقبول ہو دعائے خلوص — کہ اثر خود ہو خاک پائے خلوص
غیر کی بات خوب مان گئے — نہ سنی میری التجائے خلوص

یہ غزل [illegible] میں لکھی گئی تھی، دوسری غزل جو اسی زمانہ میں لکھی گئی ہے، وہ [illegible] میں لکھی گئی ہے۔ دونوں کے مضامین میں بہت فرق ہے اپنی غزل میں "عشق ناکام" اور "بیکسی ہائے عاشقی" کے دلدوز نغمے چھیڑے گئے ہیں، دوسری

غزل میں اسرارِ طریقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، ایک میں حسرت ٹھیٹ عاشق ہیں، اپنے محبوب کے پرستار ہیں اور دوسری میں حسرت کا عشق مجاز سے گذر کر حقیقت تک آن پہونچا ہے، یعنی خود ان کے بقول

عشق ناکام بھی نہیں ناکام
وہ جو ہو جائے رہنمائے خلوص

ادبی خدمات ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ حسرت نے کس قدر کثیر تعداد میں پرانے اور موجودہ اساتذہ کے دواوین کا انتخاب شائع کیا، شاید ہی کوئی قابلِ ذکر صاحبِ دیوان شاعر اُردو زبان کا ایسا ہوگا جس کا کلام حسرت نے نہایت توجہ اور کاوش سے نہ پڑھا ہو۔ علاوہ ازیں رسائل اور اخبارات میں جو شعرا کا کلام اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں وہ بھی حسرت کی نظر سے پوشیدہ نہ رہے چنانچہ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اُردو شاعری کے گوشہ گوشہ سے مولانا بخوبی واقف تھے، اور نہ تمام ادبی تحریکات حسرت کے ذہن میں محفوظ تھیں جو وقتاً فوقتاً گذشتہ چالیس سال سے اُردو شاعری پر کارفرما ہیں، ان کے علاوہ فارسی اساتذہ کا کلام مثلاً حافظ، نظیری، سعدی، جامی، فردوسی، خیام کا مطالعہ سالہا سال تک جاری رہا، حسرت فارسی اور عربی پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے اور اسی باعث ان کے اردو کلام میں فارسی تراکیب کافی تعداد میں پائی جاتی ہیں، کتابیں پڑھنے کے علاوہ حسرت کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا چنانچہ ہزارہا نادر اور کمیاب کتابیں، رسائل کے فائل اور روزناموں کی جلدیں

آپ کے کتب خانے میں موجود تھیں، یہی کتب خانہ مولٰنا کی عمر بھر کی کمائی تھا، اور اس میں شک نہیں کہ ایسے عمدہ، مفید اور کارآمد کتب خانہ پر اس کے مالک کو ناز کرنا چاہیئے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ مولانا سرمایہ سے ہمیشہ دور رہے ہیں حیرت ہوتی ہے کہ حسرت یہ جنس گرانمایہ جمع کرنے میں کیسے کامیاب ہوئے، یقیناً یہ ان کے عزم بالجزم، ایثار، اور علم دوستی کی ایک شاندار مثال ہے۔

مولٰنا کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

کلیاتِ حسرت موہانی۔ اس کے اجزا یہ ہیں:-

حصہ اوّل ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء تک کا کلام

حصہ دوم ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء 〃 〃 〃

حصہ سوم اکتوبر ۱۹۱۶ء سے جولائی ۱۷ء 〃 〃

حصہ چہارم اگست ۱۷ء سے اپریل ۱۸ء 〃 〃

حصہ پنجم اپریل ۱۸ء سے اپریل ۲۲ء 〃 〃 〃

حصہ ششم مئی ۲۲ء سے ستمبر ۲۳ء 〃 〃 〃

حصہ ہفتم ۲۲ ستمبر ۲۳ء سے ۳۰ ستمبر ۲۳ء 〃 〃 〃

حصہ ہشتم یکم اکتوبر ۲۳ء سے ۹ نومبر ۲۳ء 〃 〃 〃

حصہ نہم نومبر ۲۳ء سے آخر دسمبر ۲۳ء 〃 〃 〃

حصہ دہم جنوری ۲۴ء سے آخر مارچ ۲۴ء 〃 〃 〃

حصہ یازدہم جنوری ۲۵ء سے دسمبر ۲۴ء 〃 〃 〃

حصہ دوازدہم جنوری ۲۵ء سے جون ۲۶ء 〃 〃 〃

ضمیمہ (الف) زمانہ طالب علمی ۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۳ء تک کا کلام

ضمیمہ (ب) جولائی ۱۹۰۱ء سے دسمبر ۱۹۴۲ء

(مطبوعہ انتظامی پریس واقع حیدرآباد دکن)

(طبع ہشتم)

ان دواوین کے علاوہ گذشتہ چالیس سال تک حسرت "اردوئے معلیٰ" کے ایڈیٹر رہے، اور اس رسالہ کی یہ ایک خصوصیت تھی کہ اس رسالہ میں تقریباً کل مضامین خود حسرت ہی رقم فرماتے تھے، ایک زمانہ میں یہ رسالہ ملک کے مقتدر جرائد میں شمار کیا جاتا تھا اور ناظرین مولانا کا کلام، تنقیدی مضامین اور انتخابات دواوین کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے، اس رسالہ کے علاوہ حسرت نے کانپور سے ایک روزنامہ "مستقل" جاری کیا تھا، جس میں ہندوستان کی سیاست پر حسرت نے ہمیشہ بے لاگ تنقیدیں کیں، اس کے فائل ہمارے پیش نظر ہیں، چند مضامین کے عنوانات یہ ہیں:-

(۱) "کانگریس اور آزادی کامل"

(ترے اقرار آساں سے ترا انکار پیدا ہے)

(۲) نہرو رپورٹ پر فاتحہ پڑھنے کے بعد

(۳) آزادی کا نیا دام فریب

(۴) شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

یہ تو عنوانات ہوئے، ان مضامین کو پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے الفاظ کے کاغذی پیرہن میں شرارے جمع کر دیے گئے ہیں اور حکومت ہند، ہندو اور مسلمان

صرف ضرورت کے وقت صالفہ ریزی شروع کر دیتے تھے۔ اس مسلسل، اور پیہم ادبی اور علمی کدوکاوش کے علاوہ حسرت نے چند نادر اور بہت مفید رسالے مرتب کئے ہیں (۱) "نوادر سخن" (۲) "معائب سخن" (۳) "متروکات سخن" (۴) "محاسن سخن" جو اہل علم نے بہت پسند کئے اور پنجاب یونیورسٹی کے بعض مشرقی امتحانات کے نصاب میں داخل ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں حسرت کی شرح دیوان غالب کا بھی ذکر کرنا ہے، جو ایک خاص ادبی شان رکھتی ہے اور جس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو دان طبقہ کو غالب سے مانوس کرایا اور اردو رنگِ شاعری میں ایک نئے باب کی ابتدا کی۔ ہزاروں اردو کے طلبا ایسے ہیں جو اسی طرح ہی کے ذریعہ غالب سے روشناس ہوئے اور غالب کے شاعرانہ بلندی اور برتری سے واقف ہو سکے۔ غالب کی صحیح قدر شناسی مسعود مرحوم اور حسرت کی مساعی جمیلہ کی ہی بدولت اس ملک میں ہو سکی، ورنہ ابھی پچاس سال اور غالب کی عظمت کی مانند تیر گمنامی میں پڑی رہتی۔

حسرت بحیثیت نقاد

اس قدر طویل عرصہ تک پڑھنے اور لکھنے کے بعد حسرت اردو کے ایک مایۂ ناز ادیب اور ایک بے مثل غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صحیح الخیال اور بالغ نظر نقاد بھی تھے۔ بڑے سے بڑے دیوان کا انتخاب چند گھنٹوں میں کر سکتے تھے اور مشکل ہی سے ادنیٰ ایسا جاندار شعر ہوگا جو حسرت کی نگاہ سے پوشیدہ رہ جائے۔ "متقدمین" "متاخرین" اور معاصر کے شعرا کے بارے میں چند نقروں میں ان کے کل کارناموں پر ایسی جامع اور مکمل اور ناقابل تردید رائے پیش کر دیتے تھے کہ سننے والے محو حیرت ہو جاتے تھے

غزلوں (یا اشعار) کی قسمیں حسرت کے خیال میں یہ ہیں

آمد (۱) عاشقانہ
(۲) عارفانہ
(۳) فاسقانہ

آورد (۱) ماہرانہ
(۲) ناقدانہ
(۳) ضاحکانہ

آمد و آورد (۱) شاعرانہ
(۲) واصفانہ
(۳) باغیانہ

چنانچہ بقول حسرت ناسخ کا کلام ماہرانہ ہے چونکہ ان کے ہاں آورد ہی آورد ہے اور جگر کا کلام بالعموم شاعرانہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں اکثر آمد پائی جاتی ہے۔ ناقدانہ کلام میں عام طور سے پند و نصائح ہوتے ہیں اور ہجو ضاحکانہ کلام کی مثال ہے۔ یہ ضرور ہے کہ چونکہ شاعری کا تعلق وجدان اور کیف روحانی سے ہے اس لئے اسے کسی کاغذی نقشہ میں مقید نہیں کیا جا سکتا، لیکن حسرت نے جو شکل پیش کی تھی وہ بہت بڑی حد تک جامع ہے۔ اور ان کا خیال تھا کہ جب تک کسی خاص رنگ میں کم از کم پانچ غزلیں وجود نہ ہوں تب تک وہ رنگ کسی شاعر سے منسوب کرنا مناسب

نہیں ہے، پانچ چھ مکمل عارفانہ غزلیں کہنے کے بعد شاعر کا کلام عارفانہ کہا جا سکتا ہے،

حسرت نے داخلی شاعری کو تین قسموں پر مشتمل کیا تھا " جو کلام خالص جذبات حسن و عشق کا حامل، اور اپنی خوبی کے لئے کسی محسوس صنعت گری کا محتاج نہ ہو وہ عاشقانہ کہلائے گا۔ اور

جس کلام میں عشق مجازی سے برتر درجہ پر عشق سے عشق، اور حسن سے حسن مطلق مراد ہو وہ عارفانہ ہو گا۔ اور اس کے برخلاف جن غزلوں میں مجازی عشق سے کمتر درجے کے جذبات ہوس کی مصوری، اور صحیح مصوری موجود ہو وہ فاسقانہ کہلائے گا۔ مثلاً عاشقانہ شاعری کی مثالیں زیادہ تر میر و مصحفی، قائم و غالب، شیفتہ و حالی، جلال لکھنوی، اور شاد عظیم آبادی کی غزلوں میں ملیں گی اور عارفانہ شاعری کے نمونے درد دہلوی، نیاز بریلوی اور آسی سکندرپوری کی غزلوں میں دستیاب ہونگی، اور فاسقانہ سخن سنجی کی تصویریں زیادہ تر جرأت اور کسی قدر مصحفی و انشا یا متاخرین میں کسی قدر مضطر خیرآبادی اور گستاخ رامپوری کے ہاں موجود ہیں۔

" فاسقانہ شاعری کو بدمذاقی پر محمول کرنا سوقیانہ و مبتذل قرار دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری مسلم ہو تو پھر اس کے دائرے کو صرف پاک جذبۂ عشق و محبت تک محدود کر دینے اور عامۂ خلائق کے ۹۹ فیصدی جذبات ہوس کو اس سے خارج کر دینے کی کوشش اور وہ بھی محض اس بنیاد پر کہ ان کا اظہار و اعلان بعض فقیہانہ و ملایانہ طبائع کی

عاشقانہ
عرفانہ

معنوی پاکیزگیٔ خیال کے لئے ناگوار ثابت ہوگا۔ خود مخالفین ہوس نگاری کی انتہائی بدمذاقی اور بے شعوری کے سوا اور کسی چیز پر دلالت نہیں کرتا البتہ اس ضمن میں حد اعتدال سے گزر جانا جیسا کہ رنگین کی بعض ریختیوں اور صاحبقراں و جان صاحب کے متبذل اشعار میں پایا جاتا ہے بیشک قابلِ اعتراض ہے۔ مگر ایسے کلام کو عاشقانہ کے بجائے فاحشانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

"اب اگر عاشقانہ شاعری کی خوبی بسیط ہونے کے بجائے مرکب ہو یعنی صنعت گری کی بھی شرمندۂ احسان ہو اور یکسر بیگانۂ تاثیر بھی نہ ہو تو اس کو عاشقانہ کے بجائے شاعرانہ کہنا چاہیئے۔ دورِ حاضر کے تقریباً کل متغزلین کی اکثر غزلیں اسی رنگِ سخن کی حامل ہیں اور "آمد و آورد" کی درمیانی تقسیم کے تحت میں آتی ہیں۔

اس کے بعد بھی شاعرانہ طرزِ سخن اگر خوبیٔ اثر سے بھی بالعموم محروم ہو تو پھر اس کو شاعرانہ کے بجائے ماہرانہ یا استادانہ کہنا چاہیئے۔ مثلاً امیر مینائی و منیر شکوہ آبادی سے لیکر بزم اکبر آبادی، ثاقب لکھنوی و ضامن کنتوری تک کی غزلیں نہ عاشقانہ ہیں نہ شاعرانہ، بلکہ ماہرانہ ہیں اور آورد کے تحت میں آتی ہیں۔ پھر اگر یہ ماہرانہ شاعری پختگی و مشاقی کے جوہر سے بھی خالی ہو، اور بقول مصحفی موزونیٔ طبع کا نتیجہ ہو تو اُسے ناظمانہ کہنا چاہیئے ....

"عاشقانہ شاعری کے مانند عارفانہ شاعری کا بھی حال ہے کہ اگر اس میں عشق و حسن مطلق کی جگہ رسمی حد یا اصطلاحی تصوف کا جلوہ نظر آتا ہو تو اس کو عارفانہ کے بجائے نافعانہ کہنا چاہیئے جو آورد کے تحت میں آئے گی۔

"یا اگر روحانی محرکات عشق سے کمتر درجہ پر جذبات خلوص و عقیدت کے ماتحت

نعت، منقبت یا سوز و سلام کے مضامین قیدِ نظم میں آئے ہوں اور فی الجملہ اثر انگیز بھی ہوں تو اس شاعری کو عاصفانہ شاعری کہنا چاہیئے۔ مثلاً غلام امام شہید، شاہ نیاز بریلوی، محسن کاکوروی، رضوان مراد آبادی، ضیا بدایونی، حمید لکھنوی یا انیس و متعلقین انیس، تعشق، رشید وغیرہم کا کلام، لیکن اگر قسم کا کلام محض صنعت گری کا مظہر ہو اور تاثیر سے محروم ہو یا محض حصول ثواب و نجات کی غرض سے وجود میں آیا ہو مثلاً امیر مینائی یا مضطر خیر آبادی کا نعتیہ دیوان یا مرزا دبیر کا تمام دفتر منظومات اس کو عاصفانہ کے بجائے ماہرانہ کہنا ہوگا یا نا قعانہ اور یہ دونوں قسمیں آورد کے تحت میں آتی ہیں۔

"علیٰ ہذالقیاس فاسقانہ شاعری میں اگر خالص جذبات ہوس کی مصوری کے بجائے سماج یا مذہب و حکومت کے احتقاف یا انکار کا پہلو نمایاں ہو تو اسے باغیانہ کہنا چاہیئے مثلاً جوش، احسان دانش، ساغر، اختر شیرانی، مجاز ردولوی وغیرہم۔ ترقی پسند ادب کے دعویداروں کی بیباک نگاری۔۔۔۔۔

"اب صرف ایک قسم سخن اور رہ گئی یعنی ضاحکانہ، جس میں یا محض ظرافت ہوتی ہے مثلاً ظریف لکھنوی یا احمق پھپھوندی کا کلام، یا ظرافت کے ساتھ طنز و قدامت پرستی کا پہلو نکلتا ہے مثلاً اکبر الہ آبادی و ظفر علی خاں کا کلام جو ضاحکانہ کے علاوہ نا قعانہ بھی ہو سکتا ہے مگر بہر حال آورد ہی کے تحت میں آ سکتا ہے۔۔۔۔۔ ہزل یا ہجو کا شمار بھی اسی قسم سخن میں ہوتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں حد اعتدال سے گذر کر پھکڑ بازی یا فحش گوئی کے درجے تک پہونچ جائیں تو اس کو ضاحکانہ کی بجائے سوقیانہ کہنا چاہیئے۔"

(حسرت کے ایک غیر مطبوعہ مقالہ سے اخذ کیا گیا)

حسرت کا سلسلۂ تلمذ یہ تھا

مومن دہلوی

|

نسیم دہلوی

|

تسلیم دہلوی

|

حسرت موہانی

شفیق جونپوری — شفقت کاظمی

رنگ کلام اِس سلسلہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت کے کلام کا رنگ کیا تھا جس کی جانب انھوں نے اپنی غزلوں کے مقطعوں میں بار بار اشارہ کیا ہے۔

پیروِ تسلیم ہوں، شیدائے اندازِ نسیم
شوق ہے حسرت مجھے اشعارِ حسرت خیز کا

حسرت مجھے پسند نہیں طرزِ لکھنؤ
پیرو ہوں شاعری میں جنابِ نسیم کا

پھر یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ

رکھتے ہیں عاشقانِ حسنِ سخن
لکھنوی سے نہ دہلوی سے غرض

اور یہ بھی دعویٰ ہے -

مجھے فیضِ سخن پہنچا ہے حسرت
ز روحِ پاکِ شمس الدین تبریزؒ

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

پسند آیا طریقِ شاعری تیرا ہمیں حسرت
کہ جب کہنا کچھ نغز کہنا بے بدل کہنا

شعر سے تیرے ہوئی عاشقی و میر کے بعد
تازہ حسرت اثر و حسنِ بیاں کی رونق

گذرے بہت استاد مگر رنگِ اثر میں
بے مثل ہے حسرت سخنِ میر ابھی تک

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

شعر میرے بھی ہیں پُر درد و لیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

طرزِ مومن میں مرحبا حسرت
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

شعر دراصل ہیں وہی حسرت ‏ ‏ سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

نسیم دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت ‏ ‏ جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسوں کاری

کہاں سے آئینگی نیرنگیاں ترکیب مومن کی ‏ ‏ یہ لطف خوش بیانی حسرت رنگیں بیاں تک ہے

طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض ‏ ‏ غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن

قائم ہے ترے دم سے طرزِ سخن قائم ‏ ‏ پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگِ غزل خوانی

ان اشعار سے حسرت کے نظریۂ شاعری پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ شعر میں اثر اور سوز و گداز ہونا اُن کے نزدیک لازمی تھا، جو موزوں الفاظ اثر سے خالی ہوتے ہیں اور جن کی مثالیں لکھنوی شعرا کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں، شعر نہیں کہلائے جا سکتے، ایسے اشعار کے لئے ناسخ سے زیادہ مشہور شاید ہی کوئی ہو، حسرت کہتے تھے کہ ناسخ کے ضخیم دیوان پڑھ لینا جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں، یہ ایسا ریگستانی علاقہ ہے جہاں تری، سبزی اور نخلستان بہت کم یاب ہیں، اس کے باوجود حسرت لکھنؤ کی زبان کے قائل تھے، اور اس کی شستگی، رنگینی، صفائی اور چستی کے معترف تھے، ایسا نہیں کہ وہ لکھنوی رنگ کے خارجی اوصاف سے بھی منکر ہو جائیں۔ "زبان لکھنؤ" میں "رنگِ دہلی کی نمود" یعنی داخلی کیفیات اور قلبی واردات کی نگارش

پسند کرتے تھے حالانکہ اس کی نکتہ کی مزید توضیح کرتے ہوئے وہ معیاری شاعری کو لکھنوی اور دہلوی خصوصیات سے بالاتر مانتے تھے، انھوں نے غالبؔ، میرؔ، مصحفیؔ، مومنؔ قائمؔ، جرأتؔ اور انشاؔ کے افکار عالیہ کی بار بار داد دی تھی، ان کا خیال تھا کہ میرؔ سب سے افضل اور برتر ہیں، مومنؔ اور غالبؔ کہیں کہیں مغلق ہیں، اور جہاں صاف کہتے ہیں بے مثل کہتے ہیں، چنانچہ حسرتؔ کی طبع رواں نے ان تمام اساتذہ سے فیض حاصل کیا تھا، شمس تبریز (یعنی درحقیقت مولانائے رومؒ) سے اسرار و رموز تصوف" سیکھے، مومنؔ کے تتبع نے حسرتؔ کو "رنگین نگاریاں" سکھائیں، "حسنِ بیان اور اثر" میرؔ و مصحفیؔ سے حاصل کئے، نسیمؔ نے "شیرینی" عطا کی، چنانچہ حسرتؔ کے "حسرت خیز" اشعار نے "زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود پیدا کر دی۔

پروفیسر حامد حسن قادری حسرتؔ کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"حسرتؔ کے کلام میں صحیح تغزل جو دہلی کا اصلی طرز ہے نہایت اعلیٰ ہے صحیح جذبات، واردات، جوش و شوق و لطافت بیان، جدتِ اسلوب سب کچھ نہایت دلکش و موثر شکل میں موجود ہے، ....

وسعت مضمون، رفعتِ تخیل، جدتِ بیان غزل کی جدید خصوصیات ہیں۔ ان چیزوں کے لئے جدید و معنی خیز ترکیبوں کا اختراع لازم ہے

.... حسرتؔ کی شاعرانہ فطرت نے اُن کی زندگی پر اور ان کے سوانح زندگی نے اُن کی شاعری پر اثر ڈالا ہے۔ حسرتؔ عاشق ہیں تو شاعر ہیں، صوفی ہیں تو شاعر ہیں، مسلمان ہیں تو شاعر ہیں، محب

قوم و وطن ہیں تو شاعر ہیں۔ میدانِ سیاست میں گرم رو ہیں تو شاعر ہیں
گرفتار ہیں تو شاعر ہیں . . . .

. . . .

۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۲ء تک یعنی بارہ سال ان کی غزل گوئی کا بہترین دور ہے اس زمانہ کی غزلِ حسرت اردو شاعری، اردو غزل، اردو ادب کے لئے مایۂ ناز ہے، واقعیت و معنویت، شیرینی و لطافت، ندرت و جدت، لطف و اثر بہتر سے بہتر ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی فضائے سیاسی کے زمانے میں حسرت کی غزل میں ایک نمایاں انقلاب نظر آتا ہے، یعنی مذہبیت، تصوف، تسلیم و رضا کا غلبہ ہے اور ذوق و شوق جوش و ولولہ، جدت و رفعت کی کمی ہے۔"

(تاریخ و تنقید ادبیات اردو)

پروفیسر کلیم الدین کی رائے حسرت کے کلام کے بارے میں یہ ہے۔
"آخری گروپ میں وہ تین شاعر جنھیں میں حقیقی معنوں میں شاعر سمجھتا ہوں، حسرت، فانی اور فراق ہیں، یہ غزل کے لئے پیدا ہوئے ہیں
..... حسرت موجودہ شعرائے متقدمین میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ بظاہر ان کے اشعار اور دوسرے شعرا کے اشعار میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا ہے

ہم نے کس دن ترے کوچہ میں گزارا نہ کیا
تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریٔ دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا
محفلِ یار کی رہ جائے گی آدھی رونق
ناز کو اس نے اگر انجمن آرا نہ کیا

وہی کوچۂ یار، گرفتاریٔ دل اور ناز کی انجمن آرائی کا قصہ ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ یہاں فضا سراسر مختلف ہے، اور پرانی داستان نئی روح میں جلوہ گر ہے، یہاں الفاظ کے بے جا اُلٹ پھیر نہیں، یہاں فرسودہ مضامین کی خشک و بے ربط تکرار نہیں ہے بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں اختصار، اور کامیابی کے ساتھ زندہ اور لطیف احساسات کا بیان ہے مثلاً

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

جورِ پیہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا — دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

اور

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

اِن شعروں میں اصلیت کی صاف جلوہ گری ہے، یہی اُن کی تاثیر کا سبب ہے، دوسرے شعرا زیادہ کاوش، زیادہ تکلف و تصنع شاید زیادہ غور و فکر سے بھی کام لیتے ہیں لیکن وہ حسرت کی طرح

کامیاب نہیں ہوتے، حسرت کی طبیعت حساس واقع ہوئی ہے اور دل سوز و گداز عشق سے آشنا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری کی فضا مخصوص ہے جو الفاظ و مضامین سے وابستہ نہیں۔۔۔۔۔۔

مخصوص فضا کی طرح حسرت کی ایک مخصوص "آواز" بھی ہے۔ ان کا لہجہ دوسروں کے لہجہ سے یکسر مختلف ہے، ممکن ہے کہ کسی ایک شعر کو پڑھ کر (بلکہ سن کر) یہ کہنا ممکن نہ ہو کہ حسرت کی آواز ہے، لیکن کسی ایک غزل کے دو تین شعر سن کر صاحب مذاق صحیح ہے وہ کہہ اٹھے گا کہ یہ حسرت کے سوا کسی کے نہیں ہو سکتے۔ "ان کی آواز مترنم ہے، ان کے لہجہ میں نرمی اور دھیما پن اور خنکی ہے لیکن یہ چیزیں اور شعرا میں بھی مل سکتی ہیں۔ حسرت کے لہجہ کی خصوصیت یہ ہے کہ کبھی بلند و پست نہیں ہوتا، وہ سامعہ کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی آواز کو بلند نہیں کرتے، اسی طرح وہ سرگوشیاں بھی نہیں کرتے، ان کی آواز عموماً اسی سطح پر ہوتی ہے جو ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں، جذبات پرجوش ہوں لیکن وہ اپنے لہجہ کو بلند آہنگ ہونے نہیں دیتے کیونکہ انھیں اپنے جذبات پر کامل اختیار ہے، لہجہ کی یکسانی سے کوئی برا اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس یکسانی کے باوجود اس میں باریک اور ہلکے تغیرات ہوتے رہتے ہیں، یہ تغیرات اسی قسم کے ہیں جو عام بول چال میں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔"

پروفیسر آل احمد سرور کے خیال میں حسرت اپنی زندگی ہی میں کلاسیکل حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ:-

"حسرت نے تمام واقعات و حالات بیان کئے ہیں، لباس کی خوشبو، سوفے کی کیفیت، پسینے کی مہک، دانتوں میں انگلی دبانا، ننگے پاؤں کوٹھے پر آنا یہ نہ نئی باتیں اور نہ غیر معمولی مگر سرور صاحب کا خیال ہے کہ حسرت نے انھیں اس طرح دیکھا، اور ان میں اتنا کچھ پایا ہے کہ یہ نئی معلوم ہوتی ہیں آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ حسرت نہ صرف ایک قدیم روایت عظمیٰ کی آخری بڑی یادگار ہیں بلکہ اردو غزل میں برائے نام جو کچھ نئی تحریک کے اثر پائے جاتے ہیں اس کے موجد بھی ہیں، اردو غزل کی نئی نسل کی ابتدا حسرت ہی سے ہوتی ہے، حسرت اردو غزل کی تاریخ میں قدیم و جدید کے درمیان ایک عبوری حیثیت رکھتے ہیں ..."

ڈاکٹر تاثیر کی رائے یہ ہے:۔

"حسرت کا تصورِ عشق نوابی نہیں .... انسانی ہے؟
حسرت نے اس پرانی درباری غزل سے آزاد ہو کر ایک نئے دور کی ابتدا کی، اس کا عشق خلوص و نیاز کا آئینہ دار ہے عالمگیر ہوتے ہوئے ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے، یہ نہیں کہ وہ محض روحانی اور ہوائی تعلقات کو بیان کرتا ہے وہ محسوسات کی ہوسناکی سمجھتا ہے۔ اس کا مخاطب ایک انسان ہے، انسان کی لطیف ترین جنس عورت! ....
حسرت نے عشقیہ شاعری میں محسوسات کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔"

مولانا نیاز فتحپوری کا انداز یہ ہے:۔

---

۱۹ اپریل [illegible] کو لیڈر میں پروفیسر امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی نے حسرت کے کلام پر دو قطعوں میں ایک نہایت عالمانہ اور بلند پایہ تنقید سپرد قلم کی تھی جس میں فاضل نقاد نے حسرت کے کلام کی سادگی، سوز و درد آفرینی اور رمز کی داد کھول کر دی ہے

حسرت کے رنگِ تغزل کے متعلق کچھ لکھنا مسلمات و حقائق پر گفتگو کرنا ہے حسرت کی شاعری ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں حسرت کے یہاں نہ فلسفہ ہے، نہ تصوف، معنی آفرینی کی کوشش ہے، نہ "نادر رائیات" پیدا کرنے کی کاوش، لیکن یہ تمام باتیں اس کے لہجۂ تغزل پر قربان ہیں حسرت کی غزل کا ترنم و لطیف اندازِ بیان، الفاظ کی شیرینی، فارسی ترکیبوں کی حلاوت، اور توازنِ خیالات سے پیدا ہونے والی ہم آہنگی، یہ سب مل کر کچھ ایسی چیزیں بن جاتی ہیں جو ہمیں اس وقت کسی اور کے کلام میں نہیں ملتیں، پچھلے پچاس سال کے اندر سب سے پہلے جس نے تغزل کا صحیح معیار پیش کیا، اور لکھنؤ کی ابہامی شاعری کی طرف سے جس نے دفعتاً زمانہ کا رُخ پھیر دیا وہ صرف حسرت کی ذات تھی، حسرت کی نغمہ سنجیوں کو سنکر لوگ چونک پڑے، روحیں وجد کرنے لگیں اور شعر و سخن کی فضا چمک اٹھی۔ حسرت نے جس وقت غزل گوئی شروع کی اس وقت بھی وہ اپنے رنگ میں منفرد تھے، اور اب بھی کہ تغزل کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے ان کا کوئی ہمسر نہیں۔"

حسرت کے کلام پر تبصرہ

حسرت نے تمام عمر جو کچھ کہا غزل کے حدود کے اندر کہا ہے

عشق حسرت کو ہے غزل کے سوا
نہ قصیدے نہ مثنوی کی ہوس

قصیدہ، مثنوی، رباعی، ر[illegible] مسدس، کسی صنفِ شاعری سے حسرت کا دور کا

بھی تعلق نہیں، اور چونکہ غزل میں ایک نوعیت کے مضامین ہونے چاہئیں اس لئے

"شعرِ حسرت نے سارے کھول دیئے
عشق بازی کے عقدہائے ادق"

غرض حسرت کا میدان مخصوص اور تنگ ہے اور اسی نہج سے مضامین کی نوعیت بھی عاشقانہ ہے، اگرچہ کہیں کہیں سیاست، اخلاق اور پند و موعظت کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں لیکن حسرت خصوصیت کے ساتھ عاشقانہ، عارفانہ اور فاسقانہ اشعار کے عدیم المثال استاد ہیں، گو کبھی کبھی دوسری نوع کے اشعار بھی ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں، حسرت کا اصلی میدان جس میں انکا زرخیز تخیل، اور فنکارانہ اسپ قلم جولانیاں دکھاتا ہے حسن و عشق کا میدان ہے، عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ان کی شاعری کا خاص موضوع ہیں، اور حسرت اغلباً ان ہی اشعار کی بدولت حیاتِ جاوید پائیں گے جن میں حسن و عشق کی وارداتیں محبت کی حکایتیں، الفت کے کنائے، اور جمالِ یار کے اشارے پائے جاتے ہیں

حسرت سے پہلے اردو کا شاعر شاہد بازاری کا عاشق تھا، اردو میں سب سے پہلے حسرت نے "تہنیتِ غم" سے عشق بازی کی جس کے باعث عشق میں تمکین، جذبات میں رفعت خیالات میں ترفع، اور زبان میں شستگی اور شائستگی پیدا ہو گئی، نفسِ عشق میں کوئی فرق نہیں، وہی کوچۂ یار ہے، رقیبوں سے رشک ہے، آسمان کی ناروا جفاکاری کا گلہ ہے۔ پیمانِ وفا کی فراموشی ہے عشوۂ نازنیں کے جلوے ہیں، آغازِ محبت ہے، دلِ دلگیر کی محرومی ہے۔ داستانِ بے قراری ہے۔ شکوۂ جفا ہے، ہر جبر بیداد ہے جرمِ شوق کی سزا ہے اور وہ

studies

سب کچھ ہے جو نغم عاشقی کی روایاتی خصوصیات تصور کی جاتی ہیں لیکن ہر جذبہ ایک وفادار خلوص اور سنجیدگی کا رنگ لئے ہوئے جس نے اردو غزل گوئی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا جس کا پہلا اور ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مذاقِ شاعری کا یا پلٹ ہوگئی، اور کسی سنجیدہ صحبت میں کوئی شاعر داغ کے رنگ میں غزل پڑھ دینا اپنے اوپر ایک بار سمجھنے لگا۔ سیاسی میدان میں گو حسرت کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکے لیکن شاعری کے میدان میں اس انقلاب کا سہرا تنہا ان کے سر ہے، اور یقیناً یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر ہر شاعر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

حسرت[1] سے پہلے عشق علانیہ، بے باکانہ، عامیانہ، سوقیانہ طرز پر کیا جاتا تھا۔

---

[1] اس زمانہ کا اندازِ کلام ہے۔

حسرت آتی ہے دلِ ناکام پر — اشکوٹے ڈالو خدا کے نام پر
عذر کیوں کرتے ہو اس سے فائدہ — مٹ چکے ہم لذتِ دشنام پر
کان میں سن لو کہ رسوائی نہ ہو — ہم چلے آئے ہیں جس پیغام پر
جب پسند آتا ہے میرا شعر انھیں — گالیاں پڑتی ہیں میرے نام پر
وصل کی شب کیوں نہ اترا کر چلے — صبح عاشق ہو گئی ہے شام پر
بدگمانی مجھکو لے چل ان کے ساتھ — مسکرائے جاتے ہیں ہر گام پر

دیکھا دل انکا غیر نے سینے پہ رکھ کے ہاتھ — وہ کاش دیکھتے نہ سمجھے اضطراب میں
گر نہ ہو عمرِ جوان و شاہد و سامانِ عیش — بے مزہ ہے زندگی اس کا مزا کچھ بھی نہیں
دعائیں مانگتا ہوں میں جنابِ کبریا میں — نہ چھیڑو یہ نہیں موقع شرارت اپنی ہنسنے دو
تیرے لبوں سے وصل کی انکار کیوں ہوئے — یہ نازکی میں قائل گفتار کیوں ہوئے
کریں وعدہ پر وعدہ، وہ ہم کو کیا — یہ چٹکلے یہ فقرے ہیں چلتے ہوئے
صبح ہجراں میں ادھر غمگیں ادھر انکا یہ حال — آئینہ سے کہتے ہیں یہ کیا مرا عالم ہوا
اول تو انہیں شرم رہی منہ سے نہ بولے — جب شرم گئی وصل کی حجت ہی نہیں جاتی

محبت کے پست، لچر اور فحش (بعض اوقات) ترانے کوچے اور بازاروں میں لگائے جاتے تھے۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ سماج نے شاعر کو اجازت دیدی ہے کہ وہ جو چاہے جہاں چاہے کہے۔ اس پر ہر جگہ تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوں گے۔ سماج نے چند بدنصیب عورتوں کو بازار کے کوٹھوں پر بنا سنوار کر بٹھا دیا تھا جو شاعر کا موضوع سخن تھیں، اور جن کی داخلی اور خارجی کیفیات موزوں الفاظ میں ظاہر ہوکر شاعر کے لئے سرمایۂ حیات تصور کی جاتیں اس پس منظر کو بدلنے والا، اس نقشہ بے جان کو حقیقت اور واقعیت سے رنگین کرنے والا، اس چربہ میں حیات کی تھرتھری اور ان نقوش پر روحانیت کا رنگ چمکانے والا حسرت ہی ہے[۱]۔ "بنت عم" سے محبت کرنا اور اس داستان محبت کو اشعار کا جامہ پہنانا عرب کا ورثہ ہے اور عربی ادب کے ماہر کی حیثیت سے حسرت نے اس ورثہ سے پورا استفادہ کیا۔ حسرت عاشق ہے، حسن کی دلکشیوں اور رعنائیوں کے گوشہ گوشہ پر اس کی نظر ہے، لیکن فی الجملہ اس نے جذبۂ عشق اور اردو غزل کو وہ رعنائی خیال، وہ سادگی و پرکاری، وہ رفعت اور سنجیدگی عطا کی ہے جس سے ہمارے لٹریچر کو مہذب اور ہماری کلچر کو شائستہ بنا دیا۔

یہ تو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ حسرت ایک سچے اور مخلص عاشق تھے، مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس نوع کے شاعر تھے، ان کے عشقیہ ترانوں کی لئے کیسی تھی؟ یہ سوالات بہت دلچسپ ہیں، ان کے جواب دینے کی کوشش کرنے میں ہمیں اس شاعر کی غزل گوئی کی چند خصوصیات بھی معلوم ہو جائیں گی۔ ظاہری طور پر

۱؎ ع تو نے حسرت کی عیاں تہذیب رسم عاشقی

حسرت جیسے سادہ مزاج اور خلوص کا پتلا تھے، یہی دو خوبیاں ان کے عشقیہ ترانوں کی خصوصیات ہیں، وہ سیدھے سادے بھولے عاشق ہیں، ان کے عشق کے خمیر میں سادگی، انکسار، خلوص اور ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ پایا جاتا ہے، وہ عشق کرتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے، وہ عشق اس لئے کرتے ہیں کہ ایسا کرنا ان کی فطرت ہے اور وہ اس فطرت سے مجبور بھی ہیں اور شاداں بھی، مجبور اس لئے کہ اس نے ان کی آزادیٔ فکر چھین لی اور شاداں اس لئے کہ اس سے ان کے کردار کی تکمیل ہوتی ہے۔ ان کی لَے میں ایسا درد ہے، ایسی ٹیس ہے کہ سننے والا ایک شیریں قسم کی چبھن اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اور بقول غالب سُننے والا یہ سمجھتا ہے کہ

"گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

حسرت کی سچ دھج چاہے شاعری کی سی معلوم نہ ہو لیکن ان کی محبت کی داستان ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روزِ ازل ہی سے ان کا دل عشق کی لذت سے بہرہ یاب ہو گیا تھا، ان کو اپنے محبوب سے محبت ہے، اپنے وطن سے محبت ہے، اور اپنے مذہب کے وہ سچے پرستار ہیں اور اپنے محبوب کے لئے وہ سراپا ایثار و قربانی ہیں، وہ محبوب سے مطالبہ بھی کرتے ہیں لیکن ادب سے، احترام کے ساتھ، نیچی اور دھیمی آواز میں،

جو دور کبھی نظر تجھ پہ یار ہم کرتے ۔۔۔ ہزار جان گرامی نثار ہم کرتے
وہ بار بار سزا جرم شوق پر دیتے ۔۔۔ مگر قصور وہی بار بار ہم کرتے
اگر ذرا بھی انھیں مائل کرم پاتے ۔۔۔ تو جانِ زار کو امیدوار ہم کرتے

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز   تجھ کو آخر آشنائے ناز بیجا کر دیا

تیری نسبت سے ستمگر ترے مایوسوں نے   داغِ حرماں کو بھی سینے سے لگا رکھا ہے

کر دیا زبانِ شوق سے سب شرح آرزو   الفاظ میں اگرچہ صراحت نہ ہو سکی

وہ خفا ہیں کہ دعا بھی تھی شکایت میری   میں ہوں محجوب کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

ان اشعار سے حسرت کے عشق کی نوعیت پوری طرح ظاہر ہو سکتی ہے۔ حسرت یہاں تک "سرگرم نیاز" ہے کہ آخر کار محبوب کو "آشنائے نازِ بیجا" کر دیتا ہے لیکن وہ اس کے سوائے کچھ نہیں کر سکتا کہ داغِ حرماں کو سینہ سے لگائے رکھے، محبوب اپنی "شکایت" پر خفا ہے، اس کے چہرے پر برہمی کے آثار ہویدا ہیں، اور حسرت ششدر کھڑے ہیں کہ اب "دیکھئے کیا ہوتا ہے" زبان سے کچھ ادا نہ کر سکے اگرچہ چہرہ بشرہ سے جذبات کی ترجمانی ہو گئی، پھر بھی حسرت ایک "مسکین گدائے بینوا" نہیں ہے بلکہ عاشق ہے اور یہ اس کی فطرت ہے کہ

"مگر قصور وہی بار بار ہم کرتے"

حسرت نے اور شعرا کی طرح عالم خیال کو آباد نہیں کیا، بلکہ وہ اس ارض خاکی پر آباد رہے اور اسی دنیا کے حقائق اور واقعات کو اپنے اشعار کا موضوع بناتا ہے، یہ ضرور ہے کہ اس دنیا کے دل کے مقابلہ میں عالم خیال بدرجہا زیادہ رشک

رنگین اور منور ہے لیکن حسرت کا اغلباً یہ ایمان ہے کہ شاعری تنقیدِ حیات ہے۔ اس لئے وہ اس دنیا سے اجتناب کر کے عالم بالا کی جانب مائلِ پرواز نہیں ہوتا۔

یہ غزل ملاحظہ ہو،

توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جائیے — بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

اور خصوصیت کے ساتھ اس کا یہ شعر

راہ میں ملئے کبھی مجھ سے تو ازراہِ ستم — ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جائیے

یہ شعر

ان کے خط کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال — کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ انتظار

حسرت نے اپنے حسن پرست ہونے کا خود اعلان کیا ہے۔

کیا حسن پرستی بھی کوئی جرم ہے حسرت
ہونے دو جو اخلاق کی تنقید کر رہی ہے

"انس ناجائز" کے سلسلہ میں دوسری غزل کا یہ ایک شعر ہے،

کچھ فائدہ حسرت نہ ہوا ضبطِ ہوس کا
پوشیدہ محبت نہ رہی "ش" بسر کی

"لی" بسر مقیم دکن کے سلسلہ میں حسرت نے بڑے پُر درد اشعار بار بار کہے ہیں،

مشام جاں معطر ہو رہا ہے — دکن سے آتے ہیں جھونکے صبا کے

نسیمِ صبح جاتی ہے سوئے ملکِ دکن حسرت — تپش ہائے جدائی کا اسی سے ماجرا کہئے

اس شاہد رعنا کے اکرام اقامت سے — تقدیر چمک اٹھی اے ملک دکن تیری

ہے اک پیام ہمارا ابھی اے نسیم دکن — ق — خدا تجھے طرب افروز و غم شکار کرے
ملے جو اس سے تو کہنا کہ تیرے شوق کا راز — کہاں تلک دل حسرت نہ آشکار کرے

لاتی ہے شوق یار کی خوشبو دکن سے روز — دیوانہ کر نہ دے کہیں باد صبا مجھے

اور پھر ان اشعار کے ساتھ یہ بھی ہیں
گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال — شام دیکھو نہ مری جاں سویرا دیکھو

سر کہیں بال کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں — ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو

اور "چپکے چپکے آنسو بہانا" "کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً" "دانتوں میں انگلی دبانا" "ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا"

"میرے اصرار پر وہ ہاتھ چھڑا کر آخر
دستخط آپ سے اردو میں بنانا تیرا"

اور "قبرص کی پری" کی "جلوہ گری" کے سلسلہ میں حسرت کا یہ کہنا،

"لاریب کہ اس حسن ستمگار کی سرخی
موجب ہے مرے زہد کی عصیاں نظری کا"

ساتھ ان کے جو ہم آئے تھے بیروت سے حسرت
یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہم سفری کا

ان کی "عصیاں نظری" کی پوری پوری شہادتیں ہیں، لیکن حسرت "حسن پرستی" کے جواز کا پہلے فتویٰ دے چکا ہے، اور نہ صرف یہ بلکہ اس نے "حسن پرستی" میں وہ وفاشعاری، وہ پرتمکین وقار، اور وہ سنجیدہ، پاکیزگی اور وہ مقدس خلوص سمو دیا ہے کہ "حسن پرستی" بجائے خود ہمارے اخلاق، ہماری معاشرت اور ہماری تہذیب کو بلند کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ حسرت سے پہلے کے شعرا بھی "حسن پرستی" کرتے تھے لیکن حسرت کے نزدیک

"مسلک اہل رضا، جادۂ تقویٰ ہے یہی

عشق ہے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے   مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

بیگانۂ آرائش، مستغنیٔ آسائش   اے بے خبری حسرت حیران محبت ہے

چنانچہ وہ انداز قلندرانہ، وہ طرز درویشانہ، وہ ایثار اور خود فراموشی جو حسرت کے کردار کے نمایاں ترین خصوصیات تھیں ان کا سرچشمہ بھی جذبۂ عشق ہے جس کی مجازی اور حقیقی جھلکیاں حسرت کے دیوان میں جا بجا موجود ہیں۔ خود فرماتے ہیں۔

قابل ہوں کشاکش ہائے شوق بے نہایت کا
وہی میں بیٹھنے والا جو تھا گنج سلامت کا

حسرت کے کلام میں ماورائیت اور آفاقیت کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں،

ان کا کلام خود ان کے ذاتی محسوسات، جذبات اور واردات کا آئینہ دار ہے، صرف وہ باتیں لکھی گئی ہیں جو ان کو پیش آئیں، اور جن کے نقوش ان کی لوحِ دل پر مرتسم ہوئے، ایسی صورت میں ماورائیت اور آفاقیت کا رنگ پیدا ہونا مشکل ہے، غزل ان کے اظہار خیال کا واحد ذریعہ ہے۔ اسی لئے ان کا تصوف، ان کی سیاست اور ان کی حسن پرستی سب کچھ اسی میں موجود ہے۔ بعض شعرا فطرتاً اپنے کلام میں اپنی ذات کو زیادہ نمایاں ہونے نہیں دیتے، اس کے برخلاف حسرت کی ہر ادا، ان کے پاؤں کی ہر لغزش، اور ان کے دماغ کی ہر لہر ان کے کلام کے آئینہ میں جلوہ گر ہے، مرحومہ بیگم حسرت کی جدائی، احباب کی بےمہری، دوستوں کی یاد، عزیزوں کی موت، حکومت کی چالبازی، سیاسیین کی بےراہ روی، ابن سعود کی پالیسی، شعرا کی شاعری، مرشدین کی رہنمائی، چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن، عشق کی بادیہ پیمائی اور حسن کی کارفرمائی، غرض حسرت کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس کے گہرے اور پائیدار نقوش ان کے اشعار میں نہ پائے جاتے ہوں، یہ ساری باتیں ہیں مگر محض انفرادی نقطہ نظر سے، اپنے اشعار کی دنیا میں مرکز ثقل خود حسرت کی ذات تھی۔ اس ذات کو اگر جدا کر دیا جائے تو حسرت کا کلیات ایک ورق سادہ رہ جائے گا، چنانچہ ان حضرات کا یہ خیال صحیح ہے جن کا اندازہ یہ ہے کہ حسرت کی شاعری کا دامن تنگ ہے، وہ چیخ چیخ کر، پھٹی پھٹی آواز میں انقلاب کے نعرے سر نہیں کرتا۔ وہ مزدور سرمایہ دار کی آویزش پر نظمیں نہیں لکھتا، وہ سوادِ وطن کو کوئی پیغام نہیں دیتا۔ وہ سماج کے قیود کے پرزے نہیں اڑاتا، مگر غور سے دیکھئے تو دھیمے سروں میں ہلکی آواز میں انقلاب کا نوید بھی ہے، وطن کے لئے پیام بھی

ہے، اور مزدور کے لئے مژدۂ جانفزا بھی، غزل میں جو نرمی، شیرینی اور لطافت ہونا چاہیئے اس کا وہ سچا پرستار ہے، اس کے ہاتھ سے کبھی نہیں کھوتا اور ان ہی نرم اور شیریں الفاظ میں سب کچھ کہہ جاتا ہے،

لازم ہے یہاں غلبۂ آئین سوّیت
وہ ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

ایک اور لطف یہ ہے کہ پیرانہ سالی میں بھی حسرت کی شاعری اپنے شباب پر تھی اس کے رنگ و روغن، سج دھج آن بان میں کوئی اضمحلال کا اثر نہیں پایا جاتا، عنفوانِ شباب میں کہا تھا ؎

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا

حسرتیں دل کی ہوئی جاتی ہیں پامالِ نشاط
ہے جو وہ جانِ تمنّا رونقِ کاشانہ آج

وفورِ اشکِ پیہم سے، ہجومِ شوق بیحد میں
مری آنکھوں سے ہے اک آبشارِ آرزو جاری

۱۹۳۹ء کا فرمودہ یہ ہے ؎

تم دشمنِ عشاق بہرحال ہو یعنی
آشوبِ نظر، فتنۂ دل، آفتِ جاں ہو

یہ بھی اک چھیڑ تھی بے تنبیہ وفا
ورنہ تم یوں نہ تھے میرے ستانے والے

رفتارِ قیامت یونہی کیا کم تھی، پھر اُس پہ اک طرّہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

داغ لگ جائیگا دامانِ وفا میں حسرت تم نے دیکھو جو کہیں اور لگائیں آنکھیں

"وہ جو اک لپکا کبھی خاکِ جہاں آباد سے" حسرت لگا لائے تھے اس میں وہی زور، وہی توانائی، وہی غلبہ ہمیشہ موجود رہا، اس زمانہ کے کلام میں جب حسرت بغاوت کے سلسلہ میں ماخوذ ہوئے تھے، اور یہ جانتے تھے کہ حکومت ان کو سخت سزا دینے پر آمادہ ہے تو لیدہ بیانی اور پریشانی خاطر کا مطلق پتہ نہیں چلتا، عشق کی وہی آشفتہ سری ہے، اور محبت کے وہی دلکش و دلپذیر ترانے، چنانچہ ان کا تازہ ترین کلام (اکتوبر ۱۹۴۳ء) یہ ہے۔

البتہ ناجائز

جائز نہیں جاہ اس کی مصیبت یہ بڑی ہے کس فتنۂ ایماں سے کہاں آنکھ لڑی ہے

ہر لحظہ ہے رسوائی کونین کا دھڑکا ہر ساعت شوق اپنی قیامت کی گھڑی ہے

پہلے تو کرم خود ہی کیا تم نے، پھر اب کیوں آنکھوں سے لگی اشکِ ندامت کی جھڑی ہے

ہم کو یہ تری برہمی مرحمت آلود کیونکر نہ گوارا ہو کہ پھولوں کی چھڑی ہے

کیا حسن پرستی بھی کوئی جرم ہے حسرت
ہونے دو جو اخلاق کی تنقید کڑی ہے

ضبطِ ہوس

چادر جو کہیں حسنِ رخِ یار کی سر کی
قابو میں طبیعت نہ رہی ذوقِ نظر کی

سوتے میں جو دیکھا تھا رخِ یار کا عالم
آنکھوں میں یہ خنکی ہے ابھی تو یہ سحر کی

ہے شوق بھی گرویدہ ترے نقشِ قدم کا
مائل ہو عقیدت بھی ترے سجدۂ در کی

لغزش سی جو ہے اس کے قدم میں دمِ رفتار
یہ ناز کی مستی یہ نزاکت ہے کمر کی

چاہا تھا کہ پھر ان کو نہ چھیڑینگے یہ چھیڑا
خواہش کوئی پھر ان سے نہ کرنی تھی مگر کی

آجاتی ہے ناگاہ جدائی کی مصیبت
ہوتی ہے خبر کس کو ترے عزمِ سفر کی

یا حسن ہو یا عشق ہر اک نقش بیاں کا
کیا بات ہے اے شوخ ترے راہگذر کی

کچھ فائدہ حسرت نہ ہوا ضبطِ ہوس کا
پوشیدہ محبت نہ رہی "ش لبر" کی

حسرت کے عشق میں یاس اور نا امیدی کا عنصر مفقود تھا، اسی طرح وہ اپنے وطن کی سیاست سے بھی مایوس نہیں تھے، ان کے جذبات میں شگفتگی، رعنائی، اور امید کے عناصر کثرت سے موجود ہیں، نہ وہ رونے دھونے اور بسورنے کے قائل ہیں اور نہ انکا جذبۂ عشق روایاتی مظالم اور ستم آرائیوں کے لئے وقف ہے حسرت کا محبوب حسرت کا قدر دان ہے، کیونکہ وہ انسان ہے جو عالمِ وجود سے دور نہیں۔ اس لئے اس کے جذبات بھی دائرۂ انسانیت سے خارج نہیں، یہ سب اس لئے ہے کہ حسرت کی محبت کا تار و پود روایت سے زیادہ حقیقت پر مبنی ہے۔ چنانچہ

حسرت اور اس کے محبوب کے درمیان ایک دلکش نوعیت کی مفاہمت پائی جاتی ہے ؎

مانا کہ رسا ہیں ترے نالے مگر اے دل   اتنا بھی نہیں کرتے ہیں مجبور کسی کو

حسرت اپنے محبوب کے مظالم کے قصے دہراتا ہے لیکن اس کے لبوں پر تبسم موجود ہوتا ہے ؎

بات کیا ہے جو ہوئے جاتے ہو تم یونہیں خفا   مجھکو دیکھو، نہ مرے دل کا دھڑکنا دیکھو

تھے پاس تو منظورِ نظر راحتِ دل تھے   اب جانِ تمنّا ہو جو تم ہم سے جُدا ہو

سخت بیدرد ہے تاثیرِ محبت کہ انھیں   بسترِ ناز پہ سوتے سے جگا رکھا ہے

ستم کر کے ناحق وہ نادم ہیں حسرت   کہ ہم سے کبھی بے وفائی نہ ہوگی

دل خوب سمجھتا ہے ترے حرفِ کرم کو   ہر چند وہ اُردو ہے، نہ ترکی ہے، نہ تازی

اے عشق تری فتح بہر حال ہے ثابت   مر کر بھی شہیدانِ محبت ہوئے غازی

حاصل جو ہوئے دورِ محبت کے لذائذ   میں بھول گیا عیش و فراغت کے لذائذ

بسریند نشاط ہے دلِ شوق　　آثارِ بہار ہیں نمودار

اسے بے بتائے وہ خود جانتے ہیں　　جو میں اپنے حق میں دعا چاہتا ہوں

ان اشعار کے پڑھنے سے یہ بات بخوبی روشن ہو جائے گی کہ حسرت کے دل میں عشق و محبت کے جذبات کے ساتھ ساتھ امید، حوصلہ، اور بلند نگاری کے اثرات بھی موجود تھے جن کی وجہ سے ان کے کلام میں قنوطیت اور یاس و حرماں نصیبی کا رنگ بہت کم نظر آتا ہے، وہ لکھنؤ کی زبان کے دلدادہ ضرور تھے لیکن میت، کفن، آہ و شیون نالہ و فریاد، رگوں کا اینٹھنا، جنازے کا نکلنا، ایسے مضامین سے یکسر احتراز کرتے تھے اس کو اپنے عشق پر اعتماد ہے، اپنی محبت پر وثوق ہے، اپنے اخلاص سے وہ واقف ہے،

کثرتِ اُمید بھی عیش آفریں ہونے لگی　　انتظارِ یار بھی راحت فزا ہونے لگا

پوچھے کوئی اربابِ تمنا کے دلوں سے　　حسنِ رُخِ جاناں کی حکایت کے لذائذ

شکرِ الطاف نہیں، شکوۂ بیداد نہیں　　کچھ ہمیں تیری تمنا کے سوا یاد نہیں

جس طرح غزل کے معنوی رنگ کو حسرت نے نکھارا اسی طرح اس نے زبان کو پاکیزگی، شیرینی اور لطافت بخشی، اور یہ اردو زبان پر حسرت کا ایک ایسا

عظیم الشان احسان ہو جس سے اردو زبان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، ان کی غزلوں کی زبان میں لکھنؤ کی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ چند در چند ایسے نگینے موجود ہیں جو اور اردو شعرا کے ہاں بہت کم پائے جاتے ہیں، حسرت نے نئی تراکیب تراشی ہیں اور ان کو فن کارانہ حسن اور سلیقہ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ان کے بعض اشعار عامیانہ اور چند سوقیانہ بھی ہیں، مگر الفاظ کی نشست اور تراکیب کے حسن نے ان میں جان پیدا کر دی ہے۔ ان کے بعض اشعار میں خیالات بہت معمولی، اور بعض اوقات فرسودہ ہوتے ہیں، لیکن زبان کی شگفتگی اور رعنائی ایسے اشعار میں بھی ایک خاص لطف پیدا کر دیتی ہے ؎

ہم بھی دیکھیں جو ترے حسن دل آرا کی بہار
اس میں نقصان ترا اے گل رعنا کیا ہے

جی چاہتا ہے کہ ایسے اشعار بار بار دہرائے جائیں،

بجز تقاضا ہے یہی مجھ سے کہ اس محفل میں چل
اس دل بیتاب کی ضد کو الٰہی کیا کروں؟

دل بیتاب کی بے باکیاں ان سے یہ کہتی ہیں
ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپ کی شوخی کہاں تک ہے؟

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں
شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

زبان کی اس لطافت، شیرینی، اور شگفتگی پر ماہرانہ اور استادانہ قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ حسرت سینکڑوں ایسی دلکش اور حسین تراکیب کے موجد تھے جو اب رفتہ رفتہ اُردو میں عام ہو رہی ہیں، اور لوگوں کو اس کا علم نہیں کہ یہ ترکیبیں ہماری زبان میں کہاں سے آئیں۔ در اصل حسرت نے اُردو الفاظ کے خزانے میں بہت سے خوبصورت اور گراں مایہ جواہر ریزے جمع کر دیئے تھے۔ مثلاً سرگرم نیاز۔ نازبیجا ہائے عشرت بے حد۔ سرگرم خود آرائی۔ جفا ہائے التزامی۔ ساعدِ رنگیں۔ کشتِ خیال پامالی خشاہا۔ شرمسارِ انتظار۔ کاروبارِ انتظار۔ سرمایہ دارِ انتظار۔ کامیابِ عیش۔ صبر کی شرمساریاں عشق کی تازہ کاریاں۔ ترجمانِ شوق۔ تغافل ہائے بیدا نوازش ہائے پنہاں۔ وفورِ اشکِ پیہم۔ آبشارِ آرزو۔ روشِ حسن مراعات۔ ترامِ اقامت کشاکش ہائے شوق۔ زندانِ تمنا۔ نگاہِ کرشمہ بار۔ اور اس نوعیت کی سینکڑوں اور ترکیبیں ہیں جن کے لئے ہمیں حسرت کے دل و دماغ، فارسی ذوق اور وجدانِ صحیح کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ یہ ترکیبیں صرف وہی عالم وجود میں لا سکتا ہے جس نے غالب اور مومن کا بغور مطالعہ کیا ہے اور فارسی ادب سے محبت اور ذوقِ سلیم کا مالک ہے۔ ان میں سے نصف کے قریب تراکیب ایسی ہیں جن کے استعمال کرنے کے لئے حسرت کی سی قدرت زبان ضروری ہے مگر بہت سی حسرت کی تراشیدہ تراکیب اب اُردو ادب میں رائج ہو چلی ہیں اور ان کا رواج اُردو زبان کی ترقی کی نئی راہیں کھول رہا ہے۔ زبان کے دامن کو اس قدر وسیع کرنا، اور اُردو کے خزانۂ محدود کو مالا مال کرنا اور اس خزانہ میں ایسے نگینے داخل کرنا حسرت کے کمال کی ایک ناقابلِ فراموش دلیل ہے۔ مجموعی طور پر حسرت کا کلام مغلق نہیں ہے، انھوں نے

غالب اور مومن کا تتبع ضرور کیا مگر ہوشمندی کے ساتھ اور اس ہوشمندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر غالب اور مومن کا نصف کلام معمہ بن گیا ہے تو حسرت کا تمام کلام صاف آسان، لطیف اور شیریں ہے اس لئے ہر محفل میں بے تکلفی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے اور ہر طبقہ کے لوگ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اور یہ کبھی نہیں کہ نقدان وقار و سنجیدگی کی وجہ سے وہ پڑھے والوں، اور بازار میں چلنے پھرنے والوں کے لطف نشاط کے لئے وقف ہو جائے۔ اس سے پورا حظ اٹھانے کے لئے بلندی کردار اور سلامتی ذوق درکار ہیں۔

حسرت کے کلام میں فارسی کے اجزا اور تراکیب موجود ہیں مگر اس کے باوجود سہل ممتنع کی مثالیں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں سہل ممتنع کے بارے میں خود حسرت فرماتے ہیں۔

"سہل ممتنع سادگی و حسن بیان کی اس صنف کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں بھی تھی، اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لئے آسان ہے۔ جب خود کوشش کرے، اور ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے۔"

(اردوئے معلیٰ بابتہ اپریل ۳۰ء)

گویا سہل ممتنع میں سادگی، حسن بیان اور عام جذبات کی، لطیف ترجمانی ہونا ضروری ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

تیرے کشتے اے جان جانِ محبت　　حقیقت میں ہیں کامرانِ محبت

"سہل کہتا ہوں ممتنع حسرت　　نغز گوئی مرا شعار نہیں"

کرم بھی ترا یادگارِ وفا تھا
ترا جور بھی ہے نشانِ محبت

انھیں شوقِ خود آرائی نہ ہوتا
تو اتنا دل بھی سودائی نہ ہوتا

تغافل مجھ سے کیوں کرتے خود ان کو
اگر دعوئے زیبائی نہ ہوتا

تری بدنامیوں کا ڈر ہے ورنہ
ہمیں کچھ خوفِ رسوائی نہ ہوتا

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجئے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

خاطرِ محروم کو کر دیجئے محوِ الم
درپئے ایذائے جاں مبتلا ہو جائیے

. . . .

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

تری آرزو ہے اگر جرم کوئی
تو اس جرم کی میں سزا چاہتا ہوں

وہ مجھ کو برا جانتے ہیں تو جانیں
میں اس پر بھی ان کا بھلا چاہتا ہوں

میں بیمارِ غم ہوں، مداوائے غم کو
ترے در کی خاکِ شفا چاہتا ہوں

اسے بے بتائے وہ خود جانتے ہیں
جو میں اپنے حق میں دعا چاہتا ہوں

مصیبت بھی راحت فزا ہو گئی ہے
تری آرزو رہنما ہو گئی ہے

یہ وہ راستا ہے دیارِ وفا کا
جہاں بادِ صرصر صبا ہو گئی ہے

گنہگار ہوں اک خطا ہو گئی ہے
ہیں درماندہ اس بارگاہِ عطا کا

ترے شوق میں کیا سے کیا ہو گئی ہے
ترے رتبہ دانِ محبت کی حالت

نفس مضمون کے اعتبار سے حسرت کے کلام میں یکسانیت نہیں ہے، ان کے مزاج اور دل کی کیفیت میں جو فرق پیدا ہوا وہی فرق ان کے کلام میں بھی ظاہر ہوا ان کے پہلے آٹھ دس سال کے کلام میں عشق کی آشفتہ سری محبت کی گرمی اور جذبات کی فراوانی موجود ہے، معاملہ بندی، عاشقانہ چوچلے، رقیبوں سے نوک جھوک، حسن کی پرستش، میگساری، رندی و ہوسناکی کے مضامین اس دور کے کلام میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ (چونکہ حسرت کی زندگی کا کوئی پہلو ضبط اور سنجیدگی کی قیود سے آزاد نہیں اس لئے حسرت کے ہاں افراط و تفریط کی مثالیں بہت کم ہیں) حسرت کے آخری دور کے کلام میں تصوف اور مذہب کا رنگ نمایاں ہونے لگا ہے۔ حسن و عشق کی داستانیں ہیں یہاں تک کہ ان کی دو غزلوں کا عنوان "انس ناجائز" ہے لیکن شاعر کی زیادہ توجہ تصوف کی جانب ہے اور یقیناً یہ فرق حسرت کی طبیعت سے وابستہ ہے۔ زندگی کی آخری منزل میں روح پر اکثر تصوف کا رنگ نکھرنے لگتا ہے۔ حسرت شروع ہی سے تصوف کی جانب مائل تھے، زندگی کے اس دور میں اس میلان کو اور زیادہ تقویت حاصل ہوئی۔

حسرت نے لکھنؤ کی زبان کا تتبع تو ضرور کیا لیکن ایک خاص احتیاط کے ساتھ انھوں نے اردو اور فارسی کی پرانی اور فرسودہ تلمیحات کو یک قلم نظر انداز کر دیا حسرت کی رہبری کے لئے نہ خضر کی ضرورت ہے اور نہ اس کی منزلِ مقصود آبِ حیواں ہے

وہ کسی لیلیٰ کا عاشق نہیں ہوا، بہ الفاظ دیگر اس کی محبوبہ وادیٔ نجد کی لیلیٰ نہیں ہے بلکہ ہندوستانی سوسائٹی کے درمیانی طبقہ کی ایک ذی حیات، باعصمت، پردہ نشین خاتون ہے، چنانچہ خود حسرتؔ کو نہ کبھی مجنوں بننے کا حوصلہ ہوا۔ اور نہ فرہاد کے لباس میں اس نے کوہ کنی اختیار کی وہ صرف عاشق ہے اور اس کے عشق کے اظہار کے لئے لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد کے افسانوں کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کا عشق ایک حقیقت ہے جسے وہ شدت سے محسوس کرتا ہے اور یہ ملا کہتا ہے حسرتؔ نے مے خانہ اور میگساری کے مضامین کبھی قلمبند کئے ہیں لیکن اسے کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ وہ اپنے "جام سفالی" کا "جام جم" سے مقابلہ کرے کیونکہ "جام جم" کا تصوّر اس کے ذہن سے دور ہے، ان تلمیحات کی ضرورت اکثر وہ شعرا محسوس کرتے ہیں جو فرضی عشق کو حقیقت کے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ حسرتؔ بے تکلف کہتا ہے ؎

ہے نرالی سبز کی بھی رُت روش پر بہار　　اوڑھنی بہتر تھی لیکن ارغوانی آپ کی

زلفِ شبرنگ پہ گلنار لباسی کی بہار　　آج حسرتؔ نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھی

رنگ سونے میں چمکتا ہے طرحداری کا　　طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

رونقِ پیراہن ہوئی خوبیٔ جسم نازنیں　　اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

اک مرقع ہے حُسنِ شوخ ترا کشمکش ہائے نوجوانی کا

محبوب کا ارغوانی لباس، زلفِ شب رنگ، گلنار لباسی، سونے میں محبوب کا رنگ چمکتا پیرہن کی شوخی، حُسنِ شوخ کا مرقع، یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کو شعرا نے اکثر و بیشتر اپنے اشعار کا موضوع بنایا ہے، لیکن ان کے اور حسرت کے طریقہ بیان میں ایک نہایت اہم فرق ہے۔ دیگر شعرا ان دلکش موقعوں کو بیان کرنے میں تلمیحات کی مدد حاصل کرتے ہیں لیکن حسرت کو اس قسم کے کسی سہارے کی کسی مدد کی ضرورت نہیں، وہ اپنے ذاتی مشاہدہ اور جذبہ کے سہارے سے کام لیتا ہے، اس لئے اس کے مرقعوں میں تازگی اور لطافت پیدا ہے جو اور شعرا کے مرقعوں میں کمیاب ہے۔

حسرت نے اپنے کلام میں جابجا قومی اور ملکی مسائل پر روشنی ڈالی ہے، اور سیاسی مسائل کو کچھ اس طرح منوّر کیا ہے کہ تسکین ذوق کے علاوہ ہم ان ذریں خیالات سے صحیح راہِ عمل متعین کر سکتے ہیں، وہ صرف ہمیں پیغام دے کر ہی خاموش نہیں ہو جاتا، وہ اعتماد اور صداقت کے ساتھ اس عمل کا تجربہ کر کے ہمیں وہ سبق پڑھاتا ہے جس کو قوم اور ملک صدیوں تک پر کار عمل اور مرکز حیات بنائے بغیر نہیں رہ سکتی، چنانچہ ان اشعار میں خودداری کا جو سبق دیا گیا ہے اس کا جواب طویل سے طویل قومی نظموں میں مشکل سے ملے گا ؎

ہمتِ سربلند سے پاس کا انسداد کر ‏ ‏ اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
روشنئ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر ‏ ‏ قول کو زیدو عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان

باطل قیادت کی پہچان، اور اس کی عدم قبولیت کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے ؎

حق سے بعذرِ مصلحتِ وقت پہ جو کرے گریز — اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پر نہ اعتماد کر

آزادیٔ کامل، عدم تعاون اور معاشرتی تباہ حالی کا واحد حل یوں بیان کرتے ہیں ؎

خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

احساسِ کمتری کے نفسیاتی عیب کو دور کرنے کے بعد انفرادی انانیت، ایقانِ ذات کے اعلیٰ صفات کی طرف کتنا لطیف اشارہ اس شعر سے ملتا ہے ؎

غیر کی جدوجہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

آج سے تقریباً تیس سال پہلے مسلمانوں میں سیاسی شعور کا فقدان تھا، اور قومی وقار ایک طوفان خیز گرداب میں پھنس گیا تھا، حسرتؔ مر کر اپنی قوم کو دیکھا ہی، عام پیغام (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) دینے کے بعد ہندوستان میں بسنے والی دوسری ملت یعنی ملتِ اسلامیہ کے بقا اور تحفظ کا سامان ان الفاظ میں فراہم کرتا ہے، عالمگیر اخوت اسلامی کو پیش نظر رکھ کر غزل کی ہمہ گیر وسعت کا اندازہ فرمائیے۔

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر — مسلماں رہ جائیں یوں خوار ہو کر
اٹھے ہیں یہ حق بیتگانِ مہذب — ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو — کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر

وفا کے ہیں طالب دل آزاد ہو کر — وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت

یوروپین اقوام کا جوع الارض، عالمگیر انقلاب، جاپان کی چین سے دشمنی پر بے لاگ تنقید موجود ہے ؎

چلنے لگی ہو سارے جہاں میں ہوائے حرص — یورپ میں پھیل گئی ہے وبائے حرص
جاپان کبھی ہوا ہے مگر آشنائے حرص — ہے چین و کوریا کے مٹانے پر مستعد

مشرق مشرق ہے، اور مغرب مغرب، دونوں میں اتحاد ممکن نہیں، حسرت اس مقولہ کو صحیح جانتا ہے یا غلط ہمیں اس سے فی الحال سروکار نہیں لیکن وہ اس کو شدت سے محسوس کرتا ہے کہ حب وطن کا جذبہ کیونکر پیدا ہوتا اور جڑ پکڑتا ہے، اہل مغرب مشرق کو کیا سمجھتے ہیں، اس کو حسرت سے سنئے اور یہ بھول نہ جائیے کہ یہ اس وقت کہا گیا تھا جب قوم جہل کی موت سو رہی تھی، سیاست کے ایک بلند مینار سے حسرت صدا دیتا ہے ؎

پھیلے گی یوں ہی شورشِ حب وطن تمام — اچھا ہے اہل جور کئے جائیں سختیاں
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام — سمجھے ہیں اہل مشرق کو شاید قریب مرگ

حسرت کی آزادی وطن کا جذبہ اور اس کی فراوانی، قوم کا خواب خرگوش اور اس کا مرثیہ، یورپ کی تمام اصلاحی تحریکوں میں تخریب و تضحیک کی روح، قانون اور حکومت کی حقیقت، ان سب کے گہرے نقوش حسرت کی ایسی غزلوں میں جابجا موجود ہیں، قومی شاعری کے منکر کلام حسرت میں ردیف اور قافیوں کی پابندیوں کے باوجود غزل میں نظم مسلسل کا لطف اٹھائیں ؎

حبِ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے — رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا　　خلق خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم　　جبر بزیر نقاب دیکھئے کب تک رہے
دولت ہندوستان قبضۂ اغیار میں　　بے حد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

حسرتؔ آزاد پر جور غلامان وقت
از رہ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

قومیت کے عناصر ترکیبی کے ہر ہر موضوع پر حسرتؔ نے قول فیصل پیش کیا ہے۔ دستوریت اور اصلاح پسندی حسرتؔ کے نصب العین آزادی کامل کے سراسر خلاف ہے اس کی جانب قوم کو حسرتؔ نے کھلے الفاظ میں متنبہ کیا ہے اور دستوریت کے جس آخری نقطہ پر دنیا کے سیاسیین وعقلا شعوری یا غیر شعوری طور پر پہونچے ہیں حسرتؔ نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ پہلی دستوری آزادی کے فریب جو ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا مضحکہ یوں اڑایا گیا ہے ؎

کس درجہ فریب سے ہے مملو　　تجویز رفارم مانٹیگو

. . . .

اور آگے چل کر اسی مفکر سیاسی نے الہامی شان کے ساتھ ایک پیش گوئی ارشاد فرمائی ہے ؎

لازم ہے یہاں غلبۂ آئین سویت

دو ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

اور اس تحریک اشتراکیت کے لب لباب کو حسرتؔ نے ایک دلکش رباعی میں پیش کیا ہے۔

ملکی ہوئی جب ائتلاد شخصی جائز نہ رہا مفاد شخصی
قومی کے مقابلہ میں حسرت تھا ہیچ کبھی اتحاد شخصی

سیاست سے ہٹ کر حسرت تصوف سے مانوس تھے، اور ان کی طبیعت اور فکر و عمل پر یہ رنگ بہت گہرا تھا جس کی چابکدستی اور حیرت انگیز وثوق کے ساتھ وہ پیچیدہ سیاسی گتھیاں سلجھانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اسی طرح وہ تصوف کے مسائل پر ایک بلند پایہ ماہر کی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہیں۔ جبر و قدر کے مسئلہ کو لیجئے۔ تصوف کا یہ ایک مشکل ترین مسئلہ ہے۔ اس دوراہے پر بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں۔ تمام افعال و اعمال انسانی دو نوع کے ہوتے ہیں (۱) اختیاری (قدر) یا غیر اختیاری (جبر) مذہب اسلام انسان کو نہ مجبور محض قرار دیتا ہے اور مختار مطلق، گویا بین بین، اس کی وضاحت مولانا یوں فرماتے ہیں:-

"تمام اعمال انسانی کی نسبت یہ امر یقینی ہے کہ وہ اپنے اختیار (قدر) کی بنا پر کرے گا یا بربنائے مشیت ایزدی سرزد ہوں گے۔ ان میں جو جو افعال مشیت الٰہی سے سرزد ہوں گے ان کے لئے کوئی سزا یا جزا نہیں، البتہ اس کا یقینی علم انسان کو عطا نہیں ہوا ہے کہ کون کون سے اعمال مشیتی ہیں اور کون کون سے اختیاری، بہر حال ضمیر اور عقل کی روشنی میں کچھ نہ کچھ ان اعمال کا بھی تھوڑا بہت علم انسان کو ہوتا رہتا ہے۔"

مولانا نے بغرض تفہیم ان اعمال کو دینیات و الٰہیات کی اصطلاح یعنی "خوف" و "رجا" سے کام لیکر بیان کیا ہے افعال بد ہا یا اعمال نیک ہر دو صورتوں میں "بیم"

خوف) اور "رجا" (امید) کا ہونا ضروری ہے۔ نیک کام میں خوف یہ ہوگا کہ اگر اس کام میں مشیت ایزدی کارفرما ہے تو جزا نہیں اور اگر کام بد ہے تو یہ خوف ہوگا کہ اگر یہ اختیاری ہے تو اس کی سزا برداشت کرنا ہوگی ورنہ نہیں "درمیانِ حد و بیم و رجا" اسی کو کہا گیا ہے۔ جس کا حسرت نے اپنی کئی غزلوں میں اشارہ کیا ہے۔ زہد اسی لئے باعثِ نخوت ہے کہ اعمال نیک کو بہر حال و بہر صورت مستحق جزا غلطی سے قرار دیا گیا اس میں "رجا" کو تو تسلیم کر لیا جاتا ہے مگر "بیم" ترک کر دی جاتی ہے، حسرت درمیانی اور اعتدال کے مسلک پر زور دیتے ہیں ؎

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
شغل بیکار ہیں سب ان کی محبت کے سوا

زہد بر بنائے تعین جزا، باعثِ نخوت و غرور ٹھہرا، اسی اعتبار سے اشتغال متصوفانہ و عابدانہ بیکار ہی نہیں بلکہ مضر بھی ہو جاتے ہیں۔ "بیم" روحِ مذاہب ہے اور اس کا آخری نقطہ محبت، الٰہیات ہو یا فلسفہ کی خشک موشگافیاں عقدۂ جبر و قدر کے حل کرنے میں ابتک ناکام رہیں۔ اس کے برخلاف مذہبِ عشق سرتاسر "تسلیم و رضا" ہے جہاں سزا کے بدلے جزا اور جزا کے بدلہ سزا بھی ہو تو بدل و جاں منظور ہوتی ہے۔ بے گناہی کے باوجود اقرارِ گنہگاری ہی حقیقی مسلکِ عشق ہے حسرت فرماتے ہیں ؎

گناہ اپنا نہیں ثابت خطا کے پھر بھی قائل ہیں
"ادب" کا ہے یہی شیوہ یہی شانِ تصوف ہے

اب "ادب" کی حقیقت کو بھی مولانا کی زبانِ فیض ترجمان سے سنئے۔ قنوطیت و یاسیت کے نظری تصوف سے ہٹ کر ارشاد ہوتا ہے ؎

ادب اک دوسرا ہے نام عشق روح پرور کا

جو راہِ عشق ہے جو زیرِ فرمانِ تصوف ہے

گذر کر راہ بیجا پیچ قدر و جبر سے حسرت

یقین اپنا مقیم شہر عرفان تصوف ہے

اور یہ یقین حسرت کے روحانی سکون اور اطمینان کا موجب ہے ؂

دشوار تھا بغیر یقین روح کا سکون

اچھا ہوا کہ دشمن تشکیک ہم رہے

موازنہ دورِ حاضر کے چند معیاری غزل گو شعرا کے کلام سے اگر حسرت کے کلام کا مقابلہ کیا جائے تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس دور میں فانی۔ جگر۔ اصغر اور فراق اونچے پایہ کے متغزلین شمار کئے جاتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی خصوصیات کلام کیا ہیں؟ ان میں سب سے زیادہ مشہور جگر ہیں جن کی شہرت کا مرکز شمالی ہندوستان کے تعلیمی ادارے ہیں اس لئے ان کو بعض ناقدین کالج کے طلبا کا شاعر شمار کرتے ہیں حالانکہ کالجوں کی فضا سے بھی باہر جگر کے پرستار کثرت سے موجود ہیں۔ جگر کے ہاں ایک قسم کے شدید والہانہ سرمستی و سرجوشی کا رنگ غالب ہے اس پر ان کے کلام کی روحانی اور بے ساختگی سونے پہ سہاگہ کا کام کرتی ہے۔ اگرچہ اس کا محبوب نادیدہ ہے، اس کا جذبۂ عشق روایتی ہے اور اس کی محبت کی دنیا خالی ہوتی ہے وہ سامعین کو اپنے خلوص سے نہیں بلکہ اپنے ترنم اور اپنی رندانہ فضا سے مسحور کرتا ہے، جگر کا کلام خصوصیت کے ساتھ صرف وہ لوگ پسند کر سکتے ہیں جن کی عمر بیس سے چالیس سال تک ہے اس کی غزلوں

میں ایک تیز قسم کی موسیقی بھی ہے لیکن اس کا زیر و بم یکسانیت پر مبنی ہے، اس کے ہاں رنگ بھی ہے لیکن صرف ایک رنگ یعنی شراب ناب کا ارغوانی رنگ، سو وہ لوگ جو آواز اور رنگ کے دلدادہ ہو سکتے ہیں صرف وہی جگر کی پرستش کر سکتے ہیں اس کی سرمستی انفرادی ہے اور نہ اس کے عشق کی داستان انفرادی۔ جگر کی غزلیں بالعموم چند مخصوص بحروں میں کہی گئی ہیں۔ ان کے ہاں بیان کی بے اختیاری ضرور ہے لیکن وہ کسی نئے طرز بیان کا موجد نہیں۔ جگر کا کلام ہم پر تھوڑی دیر کے لئے خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے، وہ ہمیں دنیا کی مکروہات اور الجھنوں سے ہٹا کر باغ کے اندر ایسے کنج میں لے جاتا ہے جہاں ارغوانی شراب ناب کے جام چھلکتے ہوتے ہیں اور جس کی فضا ایک عشوہ طراز محبوب کی مینا پاشیوں سے مخمور ہوتی ہے لیکن اس کے کلام میں چونکہ گہرائی اور گیرائی موجود نہیں اس لئے یہ دلکش فضا ہمارے قلوب سے بہت جلد محو ہو جاتی ہے اور اسی لئے ہمیں خطرہ ہے کہ شاید جگر کا کلام دیرپا نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ اپنی حدود کے اندر جگر کا کلام بہت دلکش ہے، اور دورِ جدید کا ایک مایۂ ناز شاہکار ان کی غزلیں اپنے وجد آفریں اور کیف کے اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں ؎

اور ہی کچھ کہہ رہا ہے رنگ بیتابانہ آج ۔۔۔ اڑ نہ جائے شمع کو لیکر کہیں پروانہ آج
کام آخر کر گئی، وہ نرگس مستانہ آج ۔۔۔ بھر گیا، اے منتِ ساقی مرا پیمانہ آج

جھک گیا ایک ایک میکش اس نگاہِ مست سے
تم ادھر دیکھا کئے اور لٹ گیا میخانہ آج

بادۂ ناب عجب چیز ہے ساقی! لیکن — اور ہی کچھ ترے ہاتھوں سے مزا دیتا ہے
یہ شرابی تری آنکھوں کے نہ چونکے تا حشر — کوئی اس طرح مئے ہوشربا دیتا ہے

ہجر جاناں میں غضب شورشِ مستانہ ہے — روح قالب میں نہیں، قید میں دیوانہ ہے

عاشقی امتیاز کیا جانے — فرقِ ناز و نیاز کیا جانے
ہم سمجھتے ہیں رازِ رامش و رنگ — زاہدِ پاکباز کیا جانے

مجھے چاہیئے وہی ساقیا! جو برس چلے جو چھلک چلے
ترے حسنِ شیشہ بدست سے، تری چشمِ بادہ بہ جام سے

برستا ہے کیفِ شبابِ محبت — ہر آنسو ہے، جامِ شرابِ محبت
عجب جوش پر ہے شبابِ محبت — محبت ہے مستِ شرابِ محبت

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں — حسن خود لینے لگا انگڑائیاں
ہائے وہ غم کی کرم فرمائیاں — بھیگی راتیں اور وہ تنہائیاں
عشق ہے ہر بن مو سے نغمہ زن — بج رہی ہیں ہر طرف شہنائیاں

بس اک نشۂ عشق میں چور ہو کر — پڑے رہئے اس در پہ مجبور ہو کر

حسرت موہانی

سنبھل جائیں، آسودگانِ محبّت　　نگاہیں اٹھیں شورِ سفصور ہو کر

فانیؔ کے کلام کا رنگ جگرؔ کے کلام سے بالکل مختلف ہے۔ جگرؔ کے ہاں سرجوشی ومدہوشی ہے۔ فانیؔ کے ہاں حزن و یاس۔ جگرؔ کے ہاں دنیا سے ربودگی ہے وہ مکروہات کی دنیا سے بھاگ کر رنگ و بو کے کنج میں پناہ لیتا ہے، اور دنیا کے دفترِ بے معنی کو غرقِ مے ناب کرتا رہتا ہے، فانی مردانہ تحمل اور ایک خاص وقار کے ساتھ کشمکش حیات میں بنرد آزما ہے اگرچہ اسے اس کشمکش کے نتیجہ کی پہلے سے اطلاع ہوگئی ہے۔ لوگوں نے اسے "سوز خواں"! "بیوۂ عالم" تصور کیا، اس کے رنگ یاس پر پھبتیاں کسی گئیں لیکن فانیؔ کے نغموں سے وہی دلدوزی اور وہی جگرکاوی ٹپکتی رہی جو اس کے فلسفۂ حیات کے بنیادی عناصر ہیں، فانیؔ کے ہاں گہرائی زیادہ ہے بحیثیت مفکّر کے وہ جگرؔ سے زیادہ بلند ہے لیکن جگرؔ کی سی بیباختگی اور روانی اس کے ہاں نہیں، علاوہ ازیں چونکہ اس کا تفکّر اور فلسفۂ یاس سامعین کے دماغوں سے خراج حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس لئے اسے وہ ہر دلعزیزی حاصل نہ ہو سکی جو جگرؔ کے حصّہ میں آئی۔

اجل جو آئے تو اپنا بھی کام ہو جائے　　تمام عمر کا قصّہ تمام ہو جائے
نگاہِ ناز کا صدقہ نیاز مند ہیں ہم　　کبھی قبول ہمارا سلام ہو جائے

الٹ دیا غمِ عشقِ مجاز نے پردہ　　حجابِ حسن میں کچھ راز تھے حقیقت کے

آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں — جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

جینے سے مراد ہے مرنا شاید — ورنہ فانیؔ کی زندگانی معلوم

جیے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں،

زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہیے مگر — موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

غم محسوس وہ باطل جسے کہتے ہیں مجاز — دل کی ہستی وہ حقیقت ہے جو عریاں ہو جائے

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے جس دن فانیؔ — زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

ترکِ غم ساحل کا حاصل نظر آتا ہے — لے ڈوبنے والے وہ ساحل نظر آتا ہے

بنا کے ہجر کی راتوں کو بے نیازِ سحر — تعینات کے پردے اٹھا دیے تو نے
سرودِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیے تو نے

یاسیت، حزن و ملال، اور ایک خاص قسم کی دلکشی، اور گہرائی، فانیؔ کے

کلام کی یہ چند نمایاں خصوصیات ہیں جگر سے مقابلہ کرنے کے بعد ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فانی نے جگر کے برخلاف اردو شعر و سخن میں اپنے لئے ایک مخصوص جگہ پیدا کر لی ہے اور یہ امتیاز اسے اس کے تفکر اور فلسفہ نے عطا کیا، حزن و ملال ہماری حیات سے بہت خصوصی تعلق رکھتا ہے کون ہے جس کا آئینہ دل گرد ملال سے آلودہ نہیں ہوتا؟ کون ہے جس کے قلب و جگر میں ناکامی و نامرادی کے داغ نہیں پائے جاتے؟ بالغ نظر اور غور و فکر کرنے والے ارباب ذوق کے لئے فانی کا کلام ہمیشہ دلچسپی کا موجب ہوگا۔ جگر کی دنیا تصور کی رنگین اور نغمہ ریز دنیا ہے۔ فانی کی دنیا میں ٹوٹے ہوئے دل۔ دلدوز آہیں اور فلک شگاف نعرے پائے جاتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ ہم اس دنیا میں زیادہ عرصہ تک قیام نہیں کر سکتے لیکن اس دنیا کا منظر ہماری روح کی صفائی اور ہمارے قلوب کی جلا کے لئے ضروری ہے مگر اس دنیا میں ان لوگوں کے لئے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہو جو سطحی نظر رکھتے ہیں یا جو بے سوچے سمجھے شاہراہِ زندگی پر گامزن ہیں۔

طرز ادا میں جگر اور فانی میں ایک نمایاں فرق ہو۔ فانی اپنا مفہوم صرف اشاروں اور کنایوں کے ذریعہ ادا کرتے ہیں، ان کی زبانِ قلم سے پوری بات مشکل سے نکلتی ہے ان کے اشارے زیادہ لطیف اور زیادہ فن کارانہ ہوتے ہیں، لیکن یہ دونوں اپنی طرز نگارش کی بجائے اپنے نفسِ کلام میں انفرادیت کا رنگ پیدا کر سکے، جگر نے رندی و سرمستی کے مضامین پر جو ایک خاص ترنم اور کیف سے لبریز ہوتے ہیں قدرت حاصل کی، اور فانی نے افسردگی و حزن کی ترجمانی کو اپنا خاص مشغلہ بنایا جس میں فلسفہ کی گہرائی اور ایک خاص سپردگی اور افتادگی کی شان موجود

ہوتی ہے، چونکہ میر کے علاوہ یہ خوبیاں اور شعرا میں کمیاب ہیں اس لئے فانی کا رنگِ کلام ایک بلند پایہ رتبہ کا مستحق ہے۔

فراق ایک ایسا غزل گو ہے جس نے سب سے زیادہ مغربی شعرا سے استفادہ کیا، اس لئے اس کے خیالات میں تنوع اور وسعت پیدا ہو گئی ہے، وہ حقیقی شاعر ہے، حسن و عشق کے رموز سے واقف ہے، اپنے جذبات کی ترجمانی پر قادر ہے۔ عام طور سے طولانی غزلیں سپردِ قلم کرتا ہے جن میں سے اگر چند اشعار حذف کر دیے جائیں تو خود فراق کی شہرت کے لئے مفید ہو۔

شاعر ہونے کے ساتھ وہ مفکر بھی ہے۔ غور و تامل کے بعد کہتا ہے اس کے یہاں جذبہ میں جو شدت پائی جاتی ہے وہ اس دور کے غزل گو شعرا کے یہاں اس فراوانی سے نہیں ہے جگر کے یہاں فلسفہ نہیں۔ فانی صرف فلسفہ یاس کے ماہر ہیں لیکن فراق کے یہاں نفسیاتی تجزیہ اور نئے میلانات کا مطالعہ موجود ہے اور یہ سب کچھ اس طرح اس کی غزل میں سمویا ہوا ہے کہ ناظرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ مغرب کے افکار و خیالات کے اثرات نے فراق کی غزل میں ایک انفرادی رنگ پیدا کر دیا ہے اس کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ محروم و مجروح ہے لیکن اس محرومی کے باوجود اس کے یہاں مایوسی نہیں وہ اپنے درجہ میں ایک لذت محسوس کرتا ہے، ایسی لذت کہ جس کی شیرینی بہت سی تلخ حقیقتوں کو چھپا لیتی ہے۔ اس اعتبار سے اس کا نظریہ فانی سے زیادہ وسیع اور روشن ہے۔

عشق کی کچھ ہوا لگی جب انھیں ۔۔۔ کچھ اڑا رنگ کچھ نکھر بھی گئے

حسن پر بھی کچھ آ گئے الزام
گو بہت اہلِ دل کے سر بھی گئے

آج انھیں مہربان سا پا کر
خوش ہوئے اور جی میں ڈر بھی گئے

کیا بتائیں زمیں کی رفعت
بارہا آسماں پر بھی گئے

بات میں بات اور نکل آئی
گر کبھی ان کی بات پر بھی گئے

ڈوبنے دے نہ بیچ میں بیڑا
لبِ ساحل اسے ڈبو لینا

کہیں گم گشتگانِ ہجر بھی ہیں
بوئے یار اس طرف بھی ہو لینا

زندگی کو پلا کے آبِ حیات
زہر میں بھی اسے سمو لینا

تھرتھری سی ہے آسمانوں میں
کچھ تو ہے زور ناتوانوں میں

کتنا خاموش ہے جہاں لیکن
اک صدا آ رہی ہے کانوں میں

قیدیوں کو پیامِ مرگ ملا
زندگی سی ہے قید خانوں میں

رات دن اک دیا سا جلتا ہے
اہلِ غم کے سیاہ خانوں میں

موت کے بھی اڑے ہیں اکثر ہوش
زندگی کے شراب خانوں میں

ابھی فطرت سے ہو نہ ہو نمایاں شانِ انسانی
ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

دل میں کچھ غم ہے، کچھ سرور بھی ہے
کوئی نزدیک بھی ہے، دور بھی ہے

یہ اضطراب سا کیا ہے، کہ رتیں گذریں تجھے بھلائے ہوئے، تیری یاد آئے ہوئے

حسن قاتل کا ہے کہاں تک اثر موت کی شکل بھی نکھر آئی
عاشقوں کو خوشی سے کیا لیکن یہ بلا بھی انھیں کے سر آئی
زندگی میری مجھ کو مار چکی لے مری موت تو کدھر آئی

یقین یہ ہو کہ حقیقت کھل رہی ہے گمان یہ ہو کہ دھوکے کھا رہا ہوں
محبت اب محبت ہو چلی ہے تجھے کچھ بھولتا سا جا رہا ہوں

حسرت کا کلام فانی، جگر اور فراق کے کلام سے اپنی نوعیت اور خصوصیت کی وجہ سے بہت مختلف ہے، جگر کے ہاں ایک پُر خلوص پیشہ ور کی سی رندی و مستی کا بہت گہرا رنگ ہے حسرت کے یہاں یہ رنگ محدود ہے۔ صرف اس حد تک جہاں اُن کا زہد و تقدّس تصوف ان کی رہنمائی کرتا ہے، ان حدود سے آگے وہ قدم نہیں اُٹھاتے، ان کو اپنی سنجیدگی عزیز ہے، حسرت نے بھی والہانہ طور پر شراب نوشی کی ہے لیکن ان کی شراب ہمیشہ شراب الصالحین کی سی شراب رہی، انھوں نے بھی جرعہ پر جرعہ پیئے، لیکن ایسے وارفتہ و مدہوش نہیں ہوئے کہ ان کے منہ سے شراب کی بو نکلتی، اور مے خانہ سے جھومتے ہوئے ان کو باہر آتے دیکھا جاتا۔ جگر نے اپنے کلام کے بارے میں خود کہا ہے:-

"ایک ایک لفظ چھلکتا ہوا پیمانہ ہے"

رند وہ ہوں کہ غزل بھی مری رندانہ ہے؛ معنی و لفظ نہیں بادہ و پیمانہ ہے"
اور یہ ٹکڑے "کوئی جیسے پی کر شراب آ گیا" "قیامت کو لے کر شباب آ گیا"

"ادھر جوشِ مستی ادھر چشمِ شوق" خصوصیت کے ساتھ جگر کے کلام کے رنگ کو نمایاں کرتے ہیں، حسرت کے یہاں یہ رنگ نہیں اس نے حقیقی واردات عشق کو اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے، صرف رندی و سرمستی اس کے کلام کا حاصل نہیں کہا جاسکتا اسی طرح فانی اور حسرت کا مقابلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جگر اور فانی دونوں کی نظر نہایت درجہ محدود ہے۔ دونوں کے دلوں پر ایک خاص قسم کے تاثرات مرتسم ہو سکتے ہیں۔ حیات کے چند در چند محسوسات اور تجربات ان کے ہاں موجود نہیں، ایک نے رندی پر اپنی شاعرانہ قوتیں صرف کر دیں اور رنگ بو کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گیا۔ فانی نے یاس و افسردگی کی ترجمانی کو اپنا شعار بنایا، اور اسی محدود حلقہ میں معنی آفرینی اور نازک خیالی کی داد دیتے رہے۔ البتہ حسرت اور فراق کی شاعری کی حدیں کہیں ملتی جلتی نظر آتی ہیں دونوں عشق و محبت کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ دونوں کے دلوں میں یہ جذبہ تقریباً یکساں شدت کے ساتھ کارفرما ہے۔ دونوں کے لئے یہ جذبہ مسرت اور اعتماد کا موجب ہوتا ہے، حسرت کے لئے زیادہ اور فراق کے لئے نسبتاً کم۔ حسرت اپنی شاعری کو اس ارض خاکی سے اس قدر وابستہ رکھتے ہیں کہ ان کو عالم بالا کی جانب پرواز کرنے کا کبھی دل میں خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فراق کو البتہ جب کبھی موقعہ ملتا ہے وہ اڑ نکلتا ہے اور اس پرواز میں اکثر حد ادراک سے آگے نکل جاتا ہے ورنہ پھر اس ارض خاکی پر ایسا گرتا ہے کہ اس کے بازو مجروح ہو جاتے

ہیں۔ پہلی صورت میں اس کے اشعار آفاقی اور ماورائی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں وہ صرف ایک لا یخل معما بن کر رہ جاتے ہیں۔ دونوں اپنے کلام میں حیات انسانی پر تنقید کرتے ہیں مگر کلام میں رفعت اور پاکیزگی پیدا کرنے کے لئے حسرت کے لئے صرف اس کا جذبۂ عشق و محبت کافی ہے، فراقؔ کو نفسیات کی تحلیل اور فلسفہ کے لمس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ حسرت کی محبت اس کے درویشانہ گھر کی سیدھی سادھی فضا میں خوب سرسبز ہوتی ہے، خوب پھولتی ہے، لیکن فراقؔ کی محبت کی کار فرمائی کے لئے زیادہ پُر تکلف اور شاندار ماحول کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں حسرت کی آواز میں جو نرمی، عجز اور فتادگی پائی جاتی ہے۔ اس سے فراقؔ کی آواز مقابلتاً زیادہ بلند اور دم دار ہے حسرت کی محبت میں "گھریلو" فضا طاری ہے فراقؔ کے ہاں فضا میں وہ "گھریلو پن" موجود نہیں، اور آخر میں شاید اس کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ حسرت کو زبان پر جو قدرت حاصل ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے فراقؔ کو ابھی بہت وقت صرف کرنا ہے۔

مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کا کلام اصغر کے کلام سے بھی بہت مختلف ہے۔ اصغر کے اشعار پڑھنے کے بعد خود شاعر کے بارے میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت درویش بھی ہے اور بادشاہ بھی، ان کی شاندار شخصیت کا بانکپن ان کے کلام میں موجود ہے، اور چونکہ اصغر کا دل تصوف میں ڈوبا ہوا تھا اور خود حیات اور حیات کی تحریکات سے اور لذتوں سے کوسوں دور تھا اس لئے ایک خاص قسم کی شگفتگی اور لطیف ربودگی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے، اصغر کے

کلام کا مطالعہ ہمیں زمین سے اس قدر بلند لے جاتا ہے کہ ہمیں یہ دنیا ایک موہوم سا ستارا نظر آنے لگتی ہے اور ہم اپنے اردگرد نور ہی نور، اور لطافت ہی لطافت پاتے ہیں۔ اس کے ہاں حیات کی تنقید اگر ہے تو صرف ایسی تنقید جو صرف ایک فرشتہ حیاتِ انسانی پر کر سکتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اصغر شاید اس جرائت دماغی کے مالک نہ تھے جو حسرت اور فراق کے یہاں موجود ہے، وہ کبھی کھل کر نہ کہہ سکے جو کہنا چاہتے تھے۔ ان کی روح کی آواز ہمیشہ کچھ بند ہی سی رہی۔ اس لئے ان کے کلام میں جا بجا تصنع اور آورد کی آمیزش ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں ان کا قیام الٰہ آباد میں تھا جہاں وہ بڑے پُر تکلف اور سنجیدہ طریقہ سے اپنی زندگی گذارتے تھے۔ ان کے احباب ان سے ملتے رہتے۔ اصغر ان سے بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتے۔ لیکن ان کی روح کی گہرائیوں میں جھانکنے، ان کے قلب کے نقوش پڑھ لینے اور ان کے دبے ہوئے جذبات کے محسوس کرنے کا کسی کو موقع نہ ملتا۔

خود فرمایا ہے ؎ "اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہیں

اصغر کا کلام پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا روئے سخن کسی دنیاوی محبوب کی جانب نہیں ہے بلکہ یہ کہ عشق حقیقی کی دولت اپنے دل میں لئے شاعر جو کچھ کہتا ہے حُسنِ مطلق ہی کہتا ہے۔ اس کے ہاں دو چیزیں بہت زیادہ نمایاں ہیں اس کے جذبہ کی لطافت آمیز آورد اور اس کے بیان کی شگفتگی جو ایک خاص فضا سے آگے نہیں بڑھتی۔ حُسنِ باطنی کا احساس جس قدر قوت کے ساتھ ہنا ہوے

دلوں پر اس کا کلام پڑھ کر ہوتا ہے اتنا کسی اور کے کلام کو پڑھ کر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں جو HIGH-RAPPEAL نہیں ملتا ہے وہ مشکل ہی سے کسی اور شاعر کے کلام سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کاش ان کے جذبات میں آمد زیادہ ہوتی۔ حسرت میں سادگی ہے۔ اصغر میں تکلف حسرت کے ہاں سادگی اکثر پرکاری بن جاتی ہے اور کہیں کہیں عامیانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے، اصغر اپنے CARVASS کو اکثر و بیشتر مشجر بناتا ہے مگر کبھی کبھی اس کے نقوش ایک تھے، ایک الجھاؤ بن کر رہ جاتے ہیں۔ حسرت کی عشق کی دنیا حقیقت کی دنیا ہے جس میں عاشق و معشوق جیتے جاگتے کردار کی طرح سوتے، جاگتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں لیکن اصغر کی دنیا میں فطرت۔ ازل، ابد، کونین، کائنات گلہائے رنگین۔ برق آشیاں، زمان و مکان، وادیٔ ایمن، موسیٰ کا ذوق نظر اور حسن کی وسعتیں کثرت سے پائی جاتی ہیں، جہاں کسی فانی انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ قدم مار سکے حسرت اس کے برخلاف اسی دنیا کا باشندہ ہے اور ہر حال میں وہ ارض خاکی پر پایا جاتا ہے۔ اسی باعث حسرت کے یہاں جرأت ہے بے حجابی ہے۔ اصغر کے یہاں ہراس کی لرزش ہے اور تصنع ہے۔ غزل گو کی حیثیت سے مجموعی طور پر اصغر حسرت اور فراق کی بلندی تک مشکل سے پہنچ سکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں شعرا زندگی کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اصغر صرف روحانی وسعتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اصغر کا کلام ہمارے جذبات میں کسی حد تک پاکیزگی اور رفعت پیدا کر سکتا ہے مگر پڑھے لکھے لوگوں میں بھی مشکل سے دس فیصدی ایسے ہوں گے جو اصغر کے زاویۂ نگاہ تک پہنچ سکیں

فراق اور حسرت ہر کہ ومہ کے لئے غزل خواں ہیں دل ہیں صرف محبت کی لو کا روشن ہونا ضروری ہے۔ چاہے وہ دل ایک مزدور کا ہو یا ایک سرمایہ دار کا، فراق اور حسرت کے نغموں کی وہ قدر کرتے ہوئے ان کی تھرتھری اپنی روح کی گہرائیوں میں ضرور محسوس کرے گا۔ اصغر کا کلام پڑھتے ہی ہم ایک طیارے میں بیٹھ کر عالم بالا میں پرواز کرنے لگتے ہیں اور علائق دنیوی سے ہم کچھ عرصہ کے لئے دور ہو جاتے ہیں

اصغر کے بارے میں جناب مظہر عزیز صاحب کا یہ خیال ہے:۔

"زندگی اس کے لئے ایک "دھوکا" تھی وہ تصویر سے زیادہ مصور میں منہمک ہو گیا تھا۔

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

اصغر کے اشعار میں کہیں بھی زندگی کی گرمی، تپش اور چمک نظر نہیں آتی، وہ روحانیت سے مملو ہیں اور روحانیت کی طرح سرد بھی ہیں مگر اس کے باوجود ان میں ایک سماوی شان اور خوبصورتی پائی جاتی ہے ـــــ ہمالیہ کی برف آلود سر بفلک چوٹیوں کی خوبصورتی کے مانند، جب سورج کی شعاعیں ان پر طرح طرح کی رنگ آمیزیاں کرتی ہیں! اس خوبصورتی کا اندازہ سطح زمین پر کھڑے ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے ناظر کو خود بھی اونچا اٹھنا پڑتا ہے۔ اس بلندی پر انسانی تعلقات،

جسم کی گرمی اور خوبصورتی اور زندگی کی گوناگوں کیفیات کا کہیں پتہ نہیں ملتا......"

فاضل ناقد نے خود تسلیم کیا ہے کہ اصغر کے ہاں روحانیت کی سردی پائی جاتی ہے علاوہ ازیں جا بجا مفکرانہ عمق اور گہرائی بھی موجود ہے جس کی وجہ سے اصغر کبھی ہر دلعزیز نہ ہو سکے اور اس کا خطرہ ہے کہ آگے چل کر شاید زمانہ ان کو جلد فراموش کردے۔ اصغر اپنی حیات میں بھی ایک خاص طبقہ میں مشہور و معروف تھے، ان کے الفاظ کا طلسم، بیان کی شگفتگی، معنی آفرینی اور مفکرانہ تعمق صرف ان کو پسند آسکتا ہے جو خود بالغ نظر اور صاحب بصیرت ہوں۔ حسرت کی سادہ پرکاری اور پر درد جذبات نگاری سے اصغر کے کلام کا مقابلہ کرنا کچھ عبث سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ دونوں کی دنیائیں جُدا جُدا ہیں، اردو لٹریچر میں حسرت نے اپنے لئے جو گوشہ مخصوص کرلیا ہے وہ ان کے لئے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے، اس کے برخلاف اصغر کو بہت کچھ فراموش کیا جا چکا، اردو شاعری پر ان کے اثرات زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئے اصغر ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی"

انکا افسانۂ ہستی کو سننا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ خود عرصۂ ہستی سے بلند تر ہیں، نہ ان کو عرصۂ ہستی سے تعلق ہے اور نہ اس تعلق کے آرزومند ہیں۔ شاید وہ دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھتے تھے اور دنیا والوں کی حماقت آرائیوں پر مسکراتے بھی جاتے تھے۔

"اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے"

وہ نغمۂ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے — کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے
نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں سے پار ہو جائے — مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے
سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں — نقابِ رخ الٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے

یہاں تو عمر گذری ہے اسی موج و تلاطم میں — وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

حیات و موت بھی ادنیٰ سی اک کڑی میری — ازل سے لے کے ابد تک وہ سلسلہ ہوں میں

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھیں سے فاش — آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح — لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

اس دن بھی میری روح تھی محوِ نشاطِ دید — موسیٰ الجھ گئے تھے سوال و جواب میں

کچھ ملتے ہیں اب پختگیِ عشق کے آثار — نالوں میں رسائی ہے نہ آہوں میں اثر ہے

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے — مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

ہے تقاضا ترے جلوے کی فراوانی کا — ہمہ تن دیدہ بنیں تجھ کو سراپا دیکھیں

خدا جانے کہاں ہے اصغرِ دیوانہ برسوں سے — کہ جس کو ڈھونڈتے ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی — نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت — اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

میں ہوں ازل سے گرمِ روِ عرصۂ وجود — میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

اسرارِ حقیقت کو ایک ایک سے پوچھا ہے — ہر نغمۂ رنگیں سے ہر شاہدِ زیبا سے

حسرت نے کن کن شعرا سے استفادہ کیا؟

حسرت نے کن کن شعرا سے فیض سخن حاصل کیا؟ اس سوال کا شافی جواب دینا ذرا طول امل ہے۔ انھوں نے خود فرمایا ہے:۔

"طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض"

اور اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں بہت سے استادوں کے اثرات اور نقوش پائے جاتے ہیں، جن اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا خود حسرت کو اعتراف ہے ان میں ایرانی شعرا یہ ہیں:۔

(۱) شمس تبریز، (مولانا روم)

(۲) جامی

(۳) سعدی
(۴) نظیری ، اور
(۵) فغانی

یہ تو ایرانی شعرا کی فہرست ہے جن کے بلند پایہ کلام کا حسرت نے تمام عمر غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا، اور جن کا فیض ادبی غیر شعوری اور شعوری طور پر ان کے دل و دماغ میں راسخ ہوتا گیا، اور جو بعدہٗ ان کی مشہور و معروف غزلوں میں معنوی طور پر پہونچا۔ حسرت ایک طرف تو پکے اور سچے مسلمان تھے اور دوسری جانب تصوف سے بھی کما حقہٗ بہرہ مند تھے، اس دل و دماغ کے شاعر پر ایران کے ان شعرا کے کلام کا اثر انداز ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، ان کے علاوہ اُردو کے مندرجہ ذیل شعرا کی خدمت میں بھی حسرت نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان سے فیض یاب ہونے کا اعلان بھی کیا ہے۔

میر۔ غالب۔ مصحفی۔ مومن۔ نسیم۔ اور تسنیم۔

اس فہرست سے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ اُردو کے قدیم اور جدید، دونوں دور کے شعرا سے حسرت مستفیض ہوئے، اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اردو شعرا کے وہ سچے پرستار، گہرے واقف کار، اور غائر طالب علم تھے۔ تمام عمر شعرا کے دواوین جمع کرتے اور پڑھتے رہے، اور ان کے اقتباسات اپنے موقر رسالہ میں شائع کرتے رہے، اُردو کا شاید ہی کوئی قدیم یا جدید ایسا نمایاں شاعر ہو گا جس کا کلام ان کی نظر سے پوشیدہ ہو، اور جس کے کلام کے حسن کو انھوں نے اپنا لیا ہو، وہ اخذ کرنے اور اپنانے میں وحید عصر تھے، اور ان کا کمال یہ تھا

کہ دوسرے کی شے کو اپنانے کے بعد اس پر اپنے مخصوص رنگ کی مہر ثبت کر دیتے تھے۔

حسرت کی شاعری کی زبان بڑی جاندار، اور رسیلی ہے، زبان کی یہ جانداری اور رس ان کو فارسی تراکیب سے حاصل ہوا جو انھوں نے یا تو خود وضع کیں یا غالب اور مومن کی غزلوں سے حاصل کیں، ان فارسی تراکیب کے استعمال کرنے میں حسرت نے بڑے سلیقہ مند فن کار ہونے کا ثبوت دیا ہے، اور ان کو نگینوں کی طرح بڑے حسن و خوبی کے ساتھ اپنے اشعار میں سجایا ہے۔ اسی باعث ان کے کلام میں وہ ترنم، روانی، اور صوتی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ جو فارسی کے شعرا کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کی تابناک جھلکیاں مومن اور غالب کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے لئے حسرت مومن و غالب کے اسی قدر احسان مند ہیں جس قدر فارسی شعرا کے۔

سرگرمِ شکایت، عشقِ روز افزوں، آگاہِ رعنائی، سرگرمِ خود آرائی، داغِ ناتمامی، شرمسارِ انتظار، تہذیبِ وفاداری، بادۂ پس خوردہ ادعائے ضبطِ غم، جفاہائے التزامی، خیلِ خوباں، عصیاں نظری حسنِ بے خبر، کشش ناشکیبا۔ چراغِ رہ گذارِ باد

حسرت عربی اور فارسی کی بڑی اچھی استعداد رکھتے تھے، فارسی شعرا کا کلام ان کے دماغ پر چھایا ہوا تھا، اور غیر شعوری طور پر ان کی زبان کو سنوار رہا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان غزلوں کی زبان کا رس اور حسن حسرت نے بڑی خوبی سے اپنا یا اور جنوں غزلوں میں بھی حسرت کی غزل اپنی خصوصی زبان

کی وجہ سے آسانی کے ساتھ پہچانی جا سکتی ہے، غزل کا آب و رنگ، نکھار و بانکپن بہت کچھ غزل کی زبان کا مرہون منت ہوتا ہے۔ حسرت کی غزلوں کی جان داری، اور دلکشی بہت کچھ اس کی شیریں اور لوچدار زبان کی احسانمند ہے، چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

پوشیدہ سکونِ یاس میں ہے
ایک محشرِ اضطرابِ خاموش

بڑھ چلا تھا حد سے جورِ شیوۂ بیگانگی
ورنہ میں اور اس سراپا ناز کا شکوہ کروں

کسی عنوان صبر آتا نہیں مجھ ناشکیبا کو
الٰہی کیا کروں اس خاطرِ محوِ تمنا کو

نگاہِ یار بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے
تقاضہائے پیدا میں نوازشہائے پنہاں ہیں

حُسن بے پروا کو خود بیں و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

وفورِ اشک پیہم سے ہجومِ شوق بے حد میں
مری آنکھوں سے ہو ایک آبشار آرزو جاری

ان اشعار میں حسرت کا مخصوص رنگ موجود ہے، الفاظ کا یہ انتظام و ترتیب اور شاعر کا یہ لب و لہجہ اُردو کے کسی اور شاعر میں مشکل سے ملے گا۔ ویسے یہ ضرور ہے کہ حسرت نے ہر استاد سے فیض اُٹھایا ہے لیکن انھوں نے جو کچھ

بھی فیض حاصل کیا اس پر اپنا رنگ ضرور چڑھا دیا۔ اسی باعث یہ کہا جاتا ہے کہ حسرت جس قدر قدیم ہیں اسی قدر جدید بھی ہیں، قدیم شعرا کو نئے رنگ، روپ میں اگر دیکھنا ہو، تو حسرت کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ مواد وہی قدیم ہے لیکن اس کی آب و تاب نئی ہے۔

حسرت کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اپنا مخصوص رنگ قائم رکھا۔ ان کا تتبع نہ ہو سکا ہے اور نہ شاید ہو سکے،

تو نے حسرت یہ نکالا ہے عجب رنگ غزل
اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

یہ انداز کلام "حسرت رنگیں بیان" پر ختم ہو گیا۔ ماخوذ کرنے میں حسرت یگانۂ روزگار تھے، پرانے شعرا کے کلام کو بڑی توجہ اور محنت سے پڑھتے اور ان اساتذہ سے اپنے ڈھب کے خصوصیات آزادی سے ماخوذ کر لیتے چنانچہ ڈاکٹر عبادت فرماتے ہیں۔

"حسرت میرؔ کی سادگی اور سوز و گداز کے دلدادہ ہیں چنانچہ اپنے تغزل کے یہ خصوصیات انھوں نے میرؔ ہی سے لی ہیں، مومنؔ کی رنگینی، رندی اور سرمستی انھیں پسند ہے اور یہ رنگ ان کی شاعری میں اسی سرچشمے سے آیا ہے، تسلیمؔ و نسیمؔ کی صاف گوئی پر وہ فدا ہیں اور یہ خصوصیات ان کی شاعری نے ان ہی استادوں سے حاصل کی ہیں، لیکن حسرت اس تمام خصوصیات کو جمع کر کے چند قدم آگے بھی بڑھے ہیں، جرأت کی معاملہ بندی

انشا کی شوخی، غالب کی تعیش پرستی اور داغ کی ہوسناکی کے اثرات بھی ان کے تغزل میں کسی نہ کسی حد تک ضرور آئے ہیں

.......؛

الغرض حسرت کے کلام میں اُردو کے چند در چند باکمال اساتذہ کے رنگ کی جھلک کثرت سے موجود ہے۔ ان کے اشعار ہفت رنگ قوس قزح ہیں، ایک آئینہ خانہ ہیں اس میں قسم قسم کے رنگ موجود ہیں اور طرح طرح کی صورتیں جلوہ گر پائی جاتی ہیں ان کا کلام پھولوں کا ایک گلدستہ ہے جس میں رنگ برنگ پھول موجود ہوتے ہیں اور اپنے اردگرد مشام نوازی کرتے رہتے ہیں۔

مومن کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

حال دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اُٹھے بالیں سے کیا کچھ بجا میں بیٹھا جائے ہے

رو رہا ہوں خندۂ دنداں نما کی یاد میں
آب گوہر کے لئے آنکھوں سے دریا جائے ہے

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے مرا جائے ہے

چند اور اشعار یہ ہیں :-

شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام، ہم
ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردشِ ایام ہم؟

شب ہے تجھ بن زلبس بے چین بے آرام ہم
صبح تک رو رو گئے لے لے کے تیرا نام ہم

یار و دشمن نے جتایا ہم عاشق ہوئے
ہے گنہ اپنا ہی پھر دیویں کسے الزام ہم

شب غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا — دم رکے تھا سینہ میں کمبخت جی گھبرائے تھا
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا — تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا

مومن کے یہ اشعار منتخب کر کے یہاں درج کئے جاتے ہیں کہ اندازہ ہو سکے اُن اثرات کا جو مومن کے کلام نے حسرت کے کلام پر مستقلاً چھوڑے ہیں۔ اس موقعہ پر اس کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ مومن کے پیچیدہ اور مغلق اشعار حسرت کو پسند نہ تھے، مومن جہاں اغلاق اور پیچیدگی سے پاک ہو جاتے ہیں وہاں اُن کے کلام میں ایک خاص رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو حسرت کے رنگ سے مماثل اور مشابہ نظر آتا ہے ایسے اشعار کی سادگی، اور موسیقیت تقریباً وہی سادگی اور موسیقیت ہے جو حسرت کے اشعار کی نمایاں خصوصیت ہے، اور جن کی بنا پر حسرت کے کلام میں ایک دھیمہ اور سریلا بانکپن پیدا ہوا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ خیال ہے کہ حسرت کے کلام میں جو سوز و گداز پایا جاتا ہے وہ ان کو میر کے کلام سے حاصل ہوا۔ ہمیں اس خیال سے قدرے اختلاف ہے، حسرت کے کلام میں سوز و گداز نہ تو اس قدر زیادہ ہے جس قدر میر کے کلام میں پایا جاتا ہے اور نہ وہ قنوطیت کا رنگ موجود ہے جس نے میر کو سربلند بھی کیا اور رسوا بھی۔ میر یاسیت کے امام مانے جاتے ہیں حسرت کے ہاں تلاش کے باوجود بھی حزن و یاس کا پتہ کم ملتا ہے۔ حسرت اپنے ہلکے ہلکے قہقہوں اور خندہ ہائے زیر لبی میں یکتائے روزگار ہیں۔ خود اس کا انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ میں میر کا "شیوۂ گفتار" نہ پا سکا۔

شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت　　میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں؟

حسرت کے درد کی نوعیت میر کے درد کی نوعیت سے یکسر مختلف ہے اس لئے شیوۂ گفتار میں ہمرنگی کیسے پیدا ہوتی، پھر بھی میر کی چند غزلوں میں حسرت کا انداز پایا جاتا ہے، یہ بالعموم میر کی وہ غزلیں ہیں جن میں یاسیت اور حزن کا خصوصی رنگ غالب نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو

چرخ پر اپنا مدار دیکھئے کب تک رہے　　اسی طرح روزگار دیکھئے کب تک رہے
لب پہ میرے آنکے بار ہا پھر پھر گئی　　جان کا یہ اضطرار دیکھئے کب تک رہے
اس سے تو عہد و قرار کچھ بھی نہیں درمیان　　دل ہے مرا بیقرار دیکھئے کب تک رہے

میر کا شعر ہے۔

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں　　کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

اس خیال کو حسرت یوں ادا کرتے ہیں۔

عشق بتاں کو جی کا جنجال کرلیا ہے　　حسرت یہ تم نے اپنا کیا حال کرلیا ہے

میر کی غزل ہے۔

کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھ　　جی ہی جاتے نظر آئے ہیں اس آزار کے ساتھ
رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے　　جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

دل کے تئیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا　　گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا
کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ　　ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا

شہر دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے　　ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

بند قبا کو خوباں جس وقت وا کریں گے　　خمیازہ کش جو ہوں گے ملنے کے کیا کریں گے

حسرت بند قبا کو دوسری طرح وا کرتے ہیں۔

شوق کی بیتابیاں حد سے گذر جانے لگیں　　وصل کی شب وا جو وہ بند قبا ہونے لگا

میر کی ایک اور مشہور غزل ہے

نہیں وسواس جی گنوانے کے　　ہائے رے ذوق دل لگانے کے

میرے تغیر حال پر مت جا　　اتفاقات ہیں زمانے کے

دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا　　اور بھی وقت تھے بہانے کے

اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں　　ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے

کب تو سوتا تھا گھر مرے آ کر　　جاگے طالع غریب خانے کے

یہ خالص وہ غزلیں ہیں جن کے انداز کا پر تو حسرت کے کلام میں جابجا موجود ہے اور اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حسرت نے میر سے فیض حاصل کیا اور ان کے تتبع کو اپنے لئے فخر و نازش کا موجب تصور کیا لیکن میر کی طرح حسرت کو یاس کی چاشنی کبھی نہ پسند آئی اور نہ وہ اپنی ذات کو بھول کر انفرادی نقطۂ نظر سے عمومی نقطۂ نظر کو اپنا سکے۔ جو شخص سیاست کے میدان میں قوم اور ملک کی واردات سے اس قدر متاثر ہو کہ قومی مسائل کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے مر مٹے وہ غزل کے میدان میں اس قدر تنگ داماں ہو جائے کہ سوائے آپ بیتی کے جگ بیتی کو ہمیشہ کے لئے فراموش کر دے محیر العقول بھی ہے اور ایک حد تک مایوس کن

بھی مگر اس کا کیا علاج کہ حسرت نے اسی انفرادیت کو اپنے لئے سعادت ادبی سمجھا، اور آپ بیتی کے حدود سے کبھی باہر نہ آ سکے۔

اب صفِ دوم کے شعرا کے کلام کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

نظام

گر کوئی پوچھے مجھے آپ اسے جانتے ہیں ہو کے انجان وہ کہتے ہیں کہیں دیکھا ہے
کہہ دو انصاف سے دیکھا ہے کبھی خوش بھی ہمیں غیر کو تو کبھی کہدو کہ غمگیں دیکھا ہے
حال کچھ غیر ہے گفتار ہے کچھ اور نظام کون غارت گر جاں آفت دیں دیکھا ہے

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا
بھولی بھولی جو وہ صورت دیکھی شکوۂ جور و جفا بھول گیا
خوش ہوں اُس وعدہ فراموشی سے اس نے ہنس کر تو کہا بھول گیا

گر کہوں آپ کی رنجش کا سبب ہے کچھ اور کہتے ہیں خیر جو تم نے یوں ہی جانا جانا
کبھی کچھ سُنکے وہ کچھ آنکھ ملا کر کہنا کبھی کچھ کہہ کے وہ کچھ آپ ہی شرما جانا

وہ بال سنوارا کریں بیٹھے ہوئے اپنے بگڑا کرے دل ذکر بھی اس کا نکریں گے
بے ساختہ گھر سے نکل آنا ترا بھولیں اب گوشۂ تاریک سے نکلا نکریں گے

دل لاکھ ہو بیتاب مگر چپ ہی رہیں گے
شوخی تری یاد آئے گی تڑپا نکریں گے

باتیں تری بھولے سے کبھی آ جائینگی گر یاد
پڑ جائیں گے چپ ذکر کسی کا نہ کریں گے

یہ گوشۂ تنہائی تو قسمت میں ہے اپنے
ہم بھول کے بھی یاد وہ جلسا نکریں گے

گر راہ میں بھی تم نظر آ جاؤ گے یکایک
دل تھام کے رہ جائیں گے دیکھا نکریں گے

مر جائیں گے گھٹ گھٹ کے مگر آہ کا کیا ذکر
رسوائی کا ڈر ہے تمھیں رسوا نکریں گے

بے فائدہ کیوں عذر کرو مفت کی تکلیف
تم لاکھ کہو ایک بھی شکوا نکریں گے

نظام کی ان غزلوں میں خصوصاً آخری غزل میں "شکوا نہ کرینگے"، "رسوا نہ کرینگے" وہ رنگ صاف جھلک رہا ہے جس کو حسرت نے اپنایا اور پوری چمک دمک کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کیا، اور جو آخر کار حسرت کا طغرائے امتیاز بنا۔

مصحفی اور سوز کے مماثل اور مشابہ اشعار یہ ہیں:۔

مصحفی

اس کو منظور یاں نہ آنا تھا
تپ کا آنا بھی ایک بہانا تھا

یادِ ایام بے قراریٔ دل
وہ بھی یارب عجب زمانا تھا

ملزم تیری باتوں سے ہمیں آپ ہی ہونا
اور تجھ کو کسی بات میں الزام نہ دینا

کچھ یہ بھی عداوت ہی کہ جب ہو میری نوبت
ساقی سے یہ کہتے ہو کہ اسے جام نہ دینا

ٹپکی ہی پڑتی ہے آنکھوں سے تیری کافر — تو آج بہت ہم کو سرشار نظر آیا

جس کے نہ لگا زخم تری کج نظری کا — کیا ہوئے الم اس کو خراش جگری کا

ہے جی میں اگر یک چند خبر اپنی نہ لیجئے — کہتے ہیں کہ عالم ہے عجب بے خبری کا

اے مصحفی میں خط تو لکھوں لیک وہاں تک — ہر مرغ کو ہو حوصلہ کب نامہ بری کا

غم ترا دل میں مرے پھر آگ سلگانے لگا — پھر دھواں سا اس سے کچھ اٹھتا نظر آنے لگا

عشق کے صدمے اٹھائے ہیں بہت پر کیا کہیں — اب تو ان صدموں سے کچھ جی اپنا گھبرانے لگا

دیکھتے ہی اسکے کچھ اس کی یہ حالت ہو گئی — جو مجھے سمجھائے تھا میں اس کو سمجھانے لگا

حسن اس کا اب سماں کچھ اور دکھلانے لگا — چاند سا پردے سے وہ مکھڑا نکل آنے لگا

یا وہ عالم تھا کہ کوئی اس سے واقف ہی نہ تھا — یا یہ عالم ہے کہ عالم اس پہ مر جانے لگا

عشق سے میرے جو گھبرایا تو پھر ناچار ہوا — آ گئے گھر میرے وہ مجھکو آپ سمجھانے لگا

چھوڑ دی ہے کب سے میں نے سوگند کھانی آپ کی — ہے عبث بندہ پہ مشفق سرگرانی آپ کی

بعد مدت کے ادھر آنکلے ہو تم شیخ جی — جی میں ہے کچھ آج کیجئے میہمانی آپ کی

لطف تب تک تھا کہ جب کچھ بات آئے درمیاں — آپ نے مانی ہماری ہم نے مانی آپ کی

دل میں سو سو بار اب ہم ان کے گھر جانے لگے — منہ چھپانے وہ لگے ہم ان پہ مر جانے لگے

جن کے بن دیکھے نہیں رہتا تھا ایک ساعت کبھی ہجر میں ان کے مہینے ہی گزر جانے لگے
سوزشِ دل نے مگر پھیر اندنوں تاثیر کی تم سے آنسو گرم کیوں اے چشمِ تر جانے لگے

سوز

یہ لوگ عبث لیتے ہیں کیوں نام محبت وہ یہ نہیں جن سے ہو سر انجام محبت
ہیہات عجب ساعت بد ہوگی کہ جس وقت لائی تھی صبا یار سے پیغام محبت
رسوائی عالم مرے طالع میں لکھی تھی ہووے نہ الٰہی کوئی بدنام محبت
باتوں پہ نہ جا خوبوں کی اے سوز کہ ان کا عرصہ نہیں رکھتا ہے کچھ ایام محبت

جی ناک میں آیا بتِ گلفام نہ آیا جینا تو الٰہی مرے کچھ کام نہ آیا
عالمِ تمنا میں تری جاں بلب آیا رحمت ہے خدا کی تو لبِ بام نہ آیا
قاصد کو یہ پوچھا کہ تجھے کس نے بھجایا دہشت سے اُسے یاد مرا نام نہ آیا

نہ ترحم نہ تکلم نہ تبسم نہ نگاہ کس طرح یہ دلِ ناشاد بھلا شاد رہے
صاحبو چھوڑ دو تم ہاتھ میرے قاتل کا گو کہ سر جائے و لے خاطرِ جلاد رہے

میر، مومن، مصحفی، و سوز اور نظام کی چند غزلیں پیش کی گئی ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلے گا کہ حسرت ان شعرا سے کس قدر قریب ہیں، اور کس

حد تک وہ ان سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور اول درجہ کے شعرا کے تتبع پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ دوم درجہ کے شعرا سے بھی فیض حاصل کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے ذوق طبع کے بنا پر وہ مصحفی و مومن اور سوز و نظام سے زیادہ مانوس ہیں۔ میر کی یاسیت کے وہ کبھی بہت زیادہ شیدائی نہ ہو سکے، غالب کی زبان کے وہ صرور دلدادہ تھے اور ان کی داستان عشق سے وہ متاثر اور ان کی نت نئے طرز ادا کے عاشق ہیں لیکن غالب کا فلسفیانہ رنگ ان کو زیادہ پسند نہ تھا۔ مومن کی رنگین بیانی، نظام و مصحفی کے متانت اور صفائی و حلاوت اور سوز کے طرز خاص کے وہ عاشق تھے چنانچہ میر و غالب کے علاوہ ان شعرا سے وہ بیحد متاثر ہوئے ان کی طرز میں حسرت نے بہت سی غزلیں اور اشعار وقتاً فوقتاً کہے اور اپنے دیوان کو ایک ہفت رنگ گلدستہ بنایا۔

حسرت کی چھوٹی بحر کی غزلوں میں میر کا رنگ خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہ غزل

دردِ دل کی انھیں خبر نہ ہوئی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی

اور یہ غزل

زندگی اپنی ہو کے ان سے جدا سخت گذرے گی اب اگر گذرے

اور یہ غزل

آئی بجھنے کو اپنی شمع حیات شبِ غم کی مگر سحر نہ ہوئی

خالص میر کے رنگ میں ہیں، ان کی بحریں، ان کی زبان، الفاظ کا دروبست اور ان کا داخلی رنگ میر کے رنگ سے بیحد مشابہ ہے۔ ایک اور غزل کے

وہ مصرعہ یہ ہیں :-

(۱) جستجو کی کوئی تمہید اُٹھائی نہ گئی

---

(۲) ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

ان دونوں مصرعوں کو آسانی سے میر کے مصرعے کہا جا سکتا ہے۔ اور اس غزل کے بہت سے اشعار

میں ہوں مجبور دل ہے سودائی   رخصت اے صبر اے شکیبائی

بار بار ہمیں میر کے قریب لے آتے ہیں،

مومن غزل کے امام ہیں اور حسن و عشق کے مضامین نئے نئے انداز سے والہانہ جوش و خروش کے ساتھ بیان کرتے ہیں چنانچہ حسرت کا عاشقانہ کلام (جس کا اس کتاب میں ایک جدا باب ہے، اور جس کی صرف دو تین مختصر مثالیں دی جاتی ہیں) مومن کے انداز شاعری کا پورے طور پر حامل ہے،

یہ غزل

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سر بام کہیں   جلد اے حوصلۂ دید مجھے تھام کہیں

یہ غزل

تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھکو کیا مجال   دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارا کر دیا

اور یہ غزل

اے سحر حسن یار میں اب تجھ سے کیا کہوں   دل کا جو حال تیری بدولت ہے آجکل

اس سلسلہ میں دلچسپی سے پڑھی جاسکتی ہیں۔

مصحفی بڑے کہنہ مشق شاعر تھے اور ان کے کلام کی متانت و حلاوت اب تک مشہور ہے، حسرت کی یہ دو غزلیں

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے — مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے

اور

کس قدر دشوار تھا ہم پہ جدائی آپ کی — بارے پھر اللہ نے صورت دکھائی آپ کی

خصوصیت کے ساتھ طرزِ مصحفی کی یاد تازہ کرتی ہیں، ان کے علاوہ اور سینکڑوں اشعار حسرت کی کلیات میں ایسے ملیں گے جن پر مصحفی کا ڈھنگ موجود ہے، حسرت مصحفی کو بہت پسند کرتے تھے، ان کا کلام ہمیشہ حسرت کے پیش نظر رہا اور اس کے چھاپے خود حسرت کے کلام پر پڑتے رہے چنانچہ بعض پوری پوری غزلیں مصحفی کے رنگ میں کہی گئیں۔

مصحفی کے علاوہ حسرت سوز اور نظام سے بہت قریب ہیں، ان کے کلام کا موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں پیالوں میں شراب ایک ہی قسم کی ہے صرف کشید کا فرق ہے، سوز اور نظام کے کلام میں گداختگی اور نزہت کے اجزا اور بڑھا دیئے جائیں تو حسرت سے وہ بہت قریب آجائیں گے۔

ہاں! ان کے عشق کی نوعیت میں بھی فرق ہے جس کی جانب صاف اشارہ کردینا ضروری ہے، سوز اور نظام کا عشق روایتی زیادہ اور حقیقی کم ہے اور حسرت کا عشق سراسر حقیقی ہے اور اس چیز نے ان کے اشعار میں بڑا خلوص، بڑی گرمی اور پائدار لطف پیدا کردیا ہے جو اور شعرا میں کم پایا جاتا ہے۔

فراق کا یہ فیصلہ قابل غور ہے کہ حسرت کو صف اول کے شعرا میں تو شامل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ صف دوم کے شعرا میں ان کا مقام ممتاز ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اپنے غم عشق کو غم دوراں کبھی نہ بنا سکے، ان کی محبت کی داستان کبھی دنیا کی داستانِ محبت نہ بن سکی، یہ امر اس لئے قابل توجہ ہے کہ حسرت کی "خود پرستی" نے ان کے کلام کا کردار تعمیر کیا، کلام میں رنگینی اور گرمی تو ضرور پیدا ہو گئی لیکن اس "خود پرستی" نے ان کے کلام کو اس بلندی سے محروم کر دیا جو صف اول کے غزل گو شعرا کے لئے مخصوص ہے، اسی سلسلہ میں یہ بھی سوال کیا جاتا ہے کہ کیا حسرت کا کلام ابدی ہے، کیا وہ ہمیشہ زندہ رہے گا؟ اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے، انسان کے خون میں جب تک گرمی اور حرارت موجود ہے حسرت کی گرما گرم غزلیں اور رنگین اشعار ہمیشہ پسند کئے جائیں گے، اس دنیا میں جب تک محبت کی داستانیں زندہ ہیں اور عشق کا کاروبار قائم ہے حسرت کے پرستاروں کی تعداد میں کمی واقع نہ ہو گی؛

مرحومہ بیگم حسرت

حسرت کے حالات کی تکمیل ناممکن ہے اگر ان اوراق میں مرحوم بیگم حسرت موہانی کا ذکر نہ کریں جو عرصۂ دراز تک حسرت کی رفیقۂ حیات رہیں۔ مرحومہ حسرت کی سیاسی اور ادبی و علمی جد و جہد میں پورے استحکام اور جوش و خروش کے ساتھ شریکِ کار رہتی تھیں بعض واقفکار اصحاب کا تو یہاں تک خیال ہے کہ حسرت کے عقائد کی استواری اور عمل کی چہل سالہ ہم آہنگی میں مرحومہ کا بہت کچھ دخل تھا۔ رہبر نسواں (نومبر ۱۹۳۷ء) میں ان کی ابتدائی

زندگی کا حال ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"محترم نشاۃ النساء بیگم غالباً ۱۸۸۵ء میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) کے ایک معزز ترین خاندان سادات میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سید شبیر حسن موہانی مرحوم جن کا حال میں انتقال ہوا ہے رائچور (ریاست حیدر آباد) میں وکیل ہائی کورٹ تھے۔ چونکہ سادات موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع سے رہا ہے اس لئے محترمہ نشاط بیگم قصبات اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیور تعلیم سے محروم نہ رہ سکیں اور آپ کو مذہبی تعلیمات کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی، زمانۂ دوشیزگی میں آپ کا خاص مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبہ کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں۔ اور اگر آج موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط بیگم کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے۔"

پندرہ سولہ برس کی عمر میں آپ کی شادی ہو گئی۔ حسرت کے ساتھ پہلے آپ علیگڑھ مقیم رہیں، اور آخر زمانہ میں حسرت نے اور آپ نے کان پور کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ جب تک آپ زندہ رہیں حسرت کی حقیقی معنوں میں شریک حیات تھیں ان کے شوہر نامدار کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس میں انھوں نے اپنی روح کی پوری قوت کے ساتھ شرکت نہ کی ہو۔ خود چونکہ حسرت کو کبھی عیش نصیب نہ ہوا اس لئے ان کی اہلیہ محترمہ بھی فراغت دولت اور عیش و عشرت سے بہرہ یاب نہ ہو سکیں۔ مرحومہ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ممبر تھیں اور سیاسی

جلسوں میں ہمیشہ حسرت کے ساتھ شریک ہوتی تھیں، اور آپ کی اصابت رائے اور جوش عمل سے آپ کے رفقائے کار کو ہمیشہ تقویت اور استحکام حاصل ہوتا تھا۔ آپ کے صرف ایک اولاد ہوئی۔ آپ کی صاحبزادی اب بھی کانپور میں آباد ہیں اور خدا کے فضل سے صاحبِ اولاد ہیں۔ آپ نے سفر حج میں بھی حسرت کی رفاقت کی اور اپنا سفرنامہ لکھا تھا جس کی قسطیں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کا طرزِ انشا بہت صاف اور دلکش ہے۔

آخری زمانہ میں آپ کی علالت تقریباً ایک مستقل صورت اختیار کر چکی تھی آپ کی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی ایسی مہلک قسم کی خرابی پیدا ہو گئی تھی جو جان لے کر گئی۔ حسرت نے ان کی آخری علالت اور وفات کے حالات اردوئے معلی بابتہ فروری تا اپریل ۳۷ء میں شائع کئے ہیں۔

"۱۸؍اپریل ۳۷ء ٹھیک ۱۱ بجے دن کے وقت بیگم حسرت مکروہات دنیا سے آزاد ہو کر بہ اطمینان تمام واصل بحق ہو گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون[1]

سلسلہ علالت کئی سال سے جاری تھا۔ سال بھر برابر بیمار رہتی تھیں، لیکن موسم حج کے قریب اس قدر صحت حاصل کر لیتی تھیں کہ حج کے لئے میرے ساتھ جانے میں بظاہر کوئی دشواری نظر نہ آتی تھی، چار سال یہی حال رہا۔ آخری بار یعنی ۵۴ھ میں براہ عراق سفر حج کے وقت البتہ وہ اس قدر کمزور اور بیمار تھیں کہ ان کو ساتھ لیجانے کی ہمت نہ ہوتی تھی مگر ان کی دلشکنی اور مایوسی کا خیال بھی

---

[1] انکے انتقال کے بعد حسرت نے اپنے خاندان کی ایک بیوہ سے شادی کر لی انسے آپکی ایک چار سال کی لڑکی زخالہ ہے

سوہان روح تھا۔ مجبوراً مجھکو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ بصرہ تک جہاز اور وہاں سے بغداد تک ریل میں جانا چونکہ نسبتاً آسان ہے اس لئے اُن کو وہیں چھوڑ دوں گا اور خود صحرائے عرب کے ۱۲۰۰ میل موٹر میں طے کر کے مدینے اور مدینے سے مکے ہو کر پھر اسی راہ سے واپس آؤں گا اور بغداد سے انھیں ساتھ لوں گا۔ اس تجویز کو انھوں نے سُنا اور کچھ نہ کہا ساتھ ہولیں۔ مگر بغداد پہنچکر اپنے جد امجد حضرت امام موسیٰ کاظم کے روبرو اپنے اللہ سے دعا کی کہ زیارت روضۂ رسولؐ اور حج سے محروم نہ رہوں۔ اس دعا نے تریاق مجرب کا کام کیا اور انھوں نے باوجود علالت ونقاہت تمام ارکانِ حج بخوبی ادا کئے اور دو بار مدینے اور دو ہی بار بغداد کاظمین۔ نجف و کربلا میں حاضری دیکر صحیح وسلامت واپس کانپور پہنچ گئیں۔ مگر بصرے سے کراچی پہنچتے پہنچتے علالت پھر نمودار ہوگئی جس کی روز افزوں تکلیفیں آخر کار ان کی جان ہی لے کر گئیں۔

ریڑھ کی ہڈی میں کچھ خرابی ایسی پیدا ہوگئی تھی جو ڈاکٹروں کی رائے میں لاعلاج ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے ان کے جسم کا نصف حصہ اسفل کئی ماہ سے بالکل بے حس ہوگیا تھا اور پلنگ پر پڑے پڑے کئی زخم نہایت درجہ تکلیف دہ پیدا ہو گئے تھے پسلیوں میں بھی شدید درد رہنے لگا مگر ان کی زبان سے اس کے سوا کہ جو اللہ کی مرضی" اور" اس کی مصلحت کا تقاضا" کسی نے کبھی کوئی حرف

شکایت نہ سنا۔ کبھی کبھی اتنا البتہ کہتی تھیں کہ جب بیماری میں تکلیف کی اتنی شدت ہے تو افتراق جسم و روح کے وقت کیا حال ہو گا مگر انتقال سے ایک روز قبل نماز فجر کے اوّل وقت بحالت شدت تنفس ٹوٹے پھوٹے جملوں میں مجھ سے کہا کہ "اب مجھکو کسی تکلیف کا اندیشہ نہیں ہے اس لئے کہ ابھی ابھی حضوؐر تشریف لائے تھے قدمیں نے دامن تھام لیا اور عرض کیا کہ مجھ کو بھی مدینے ساتھ لے چلئے۔ آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں ہم جلد تم کو اپنے پاس بلالیں گے اور تکلیف جانکنی کی نسبت بھی ارشاد ہوا کہ ہم ذمہ دار ہیں تم کو ایسی کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ چنانچہ اب ہم کو کوئی فکر نہیں ہے" الحمد للہ کہ نتیجہ بھی واقعی اسی شکل میں ظاہر ہوا کہ میرے سوا کسی کو آخر تک اس کا احساس نہ ہوا کہ ان کا خاتمہ اس درجہ قریب ہے۔

خدا گواہ ہے کہ راقم کے اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ ایثار و انکسار، حیا و غیرت۔ محبت و مروّت فہم و فراست۔ جرأت و صداقت، عزم و ہمت، وفا و سخا۔ حسن عقیدت صدق نیت و خلوص عبادت حسن خلق صحت مذاق، پاکی و پاکیزگی صبر و استقلال اور سب سے بڑھ کر عشق رسولؐ اور محبت حضرت حقؑ کے لحاظ سے شاید مسلمان عورتوں بلکہ مردوں میں بھی آج ہندوستان میں کم ایسے افراد موجود ہوں گے جن کو ہم بیگم حسرت سے بہتر تو کیا ان کی برابر بھی قرار دے سکیں۔ ان تمام باتوں کی تفصیل ایک

جداگانہ تصنیف کی طالب ہے لاریب ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

راقم کو بیگم حسرت کی جدائی سب سے زیادہ اس خیال سے شاق ہے کہ اب کوئی اس کی کوتاہیوں پر ملامت کرنے والا اور اس کی خامیوں پر زجر و توبیخ کرنے والا نہ رہا۔ ظاہری تعلیم کو چھوڑ کر باقی کل باتوں میں بیگم اس سے بدرجہا بہتر تھیں۔ انھیں ہر قسم کی تنبیہہ کا حق حاصل تھا جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا۔

افسوس کہ گذشتہ چند ماہ کے دوران میں مجھ سے بعض خانگی امور میں بالکل نادانستہ طور پر چند ایسی کوتاہیاں ظاہر ہوئیں جن کی بنا پر انھیں اپنے لئے میری جانب سے بیرُخی و کم التفاتی کا گمان پیدا ہو گیا اور اس کا انھیں بہت صدمہ ہوا، بعد میں اگرچہ اپنی فطری نیک طینتی اور عالی حوصلگی کی بنا پر انھوں نے میری معذرت کو صحیح تسلیم کر کے اپنے دل کو صاف کر لیا تھا مگر مجھ کو برابر پاداش عمل کا خطرہ لگا رہتا تھا جس کا اظہار میں نے اپنی آخری غزل میں بایں الفاظ کیا تھا ؎

چھوڑ کر وہ چل نہ دیں آخر زراہِ انتقام
مجھکو تنہا رات دن آنسو بہانے کے لئے

افسوس کہ جس بات کا ڈر تھا وہی سامنے آئی اور ہمیشہ کے لئے مجھکو مغموم و محروم بنا گئی۔"

حسرت کے لئے یہ حادثہ جانکاہ نہایت درجہ صبر آزما، اور روح فرسا ثابت ہوا۔ تاشیہ

ان کے دل میں درد اور آنکھ میں نمی موجود رہی۔ فرماتے تھے کہ ان کی حیات میں گھر بار کے کسی معاملہ سے کبھی سروکار نہ ہوا اب دن رات کی وہ سرکھپی ہے جس سے جیتے جی نجات ملنا محال ہے۔ ان کی یاد میں حسرت نے وہ نہایت پُر درد غزلیں کہی ہیں جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولانا کو مرحومہ سے کس قدر سچی اور گہری محبت تھی۔

وجہ کیا خواب میں نہ آنے کی — شرم انھیں ہو نہ روٹھ جانے کی
اشک باقی ہو اب نہ کوئی رقیب — نہ ضرورت کسی بہانے کی
غیر ممکن ہے تیرے بعد ہوس — دل کسی اور سے لگانے کی
سرمۂ چشم عیش تھی بخدا — خاک تیرے غریب خانے کی
مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے تجھے — سختیاں خود بخود زمانے کی
اب نہ دل ہے نہ وہ ذخیرۂ شوق — توڑ دو دل کنجیاں خزانے کی
یعنی کہنے کی ہے غرض نہ ہوس — اب کسی کو غزل سنانے کی

ان کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرت
دلفریبی ترے فسانے کی

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر — آرزوئے زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
کامۂ بار شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں — دل پہ ذوق شاعری اک بار ہے تیرے بغیر
شرکت بزم سخن سے بھی ہیں با وصف عزم — بر بنائے بیدلی انکار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے — اب وہ حاصل ہو تو اک آزار ہے تیرے بغیر
درد دل جو تھا کبھی وجہ مباہات و شرف
بہر حسرت موجب صد عار ہے تیرے بغیر

ﺳﻪ جب بیگم حسرت کانپور میں مقیم رہتے تھے ہر جمعرات کو بعد نماز عصر مرحومہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے تشریف لیجاتے تھے

کے حسرت جیسے محبت کرنے والے شوہر، اور فدا ہونے والے باپ تھے ویسے ہی آپ اپنے یاروں کے یار اور احباب کے پرستار تھے۔ اُردوئے معلّیٰ کے ذریعہ آپ نے بارہا اپنے دوستوں کی خدمت میں ہدیۂ شوق بھیجا اور اپنے عزیزوں کو محبت اور خلوص کے ساتھ یاد کیا۔ کلیات میں مرحوم عظمت اللہ[1] برقؔ کانپوری، سید ظہور الحسن[2] موہانی، رسواؔ[3]، عبداللہ خاں مرحوم شمیمؔ باندوی، تجمل حسین[4] گورکھپوری، عزیز[5] اللہ گورکھپوری[6] کا بڑی محبت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

حسرت کی شخصیت

حسرت ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے، اور تقریباً ساٹھ سال تک علمی اور سیاسی جدوجہد میں اس قدر منہمک رہے کہ جس کی مثال ملنا ہندوستان کی تاریخ میں مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ان کا انتقال لکھنؤ میں ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ وفات سے ایک مہینہ پہلے تک ان کی تگ و تاز میں سرِ مو فرق نہ آیا۔ ہندوستان کے پارلیمان کے وہ رکن تھے، اور اس کے اجلاس میں نہ صرف پابندی سے شریک ہوتے بلکہ وہاں موقعہ بموقعہ تقریریں بھی کرتے تھے، حیدرآباد

---

۱ برقؔ کے مرنے کا حسرتؔ واقعہ ایسا نہیں — کچھ نہ روئے آہ اگر ہم عمر بھر رویا کئے

۲ سچ ہے ضرور، پر نہیں آتا مجھے یقین — حسرتؔ ہے سخت واقعہ مرنا ظہور کا

۳ ایک ہمدمِ دیرینہ رسوا تھی انیسِ حسرت — سو وہ رسوا بھی اب جا کے دکن بھول گئے

۴ حسرتؔ آئیگی تسلّی کو یہاں روحِ شمیم — قید ہو آئے ہیں جھانسی میں للت پور سے ہم

۵ آخر مزید رنج شمیمؔ و عزیزؔ پر — حسرتؔ خیال برقؔ و تجملؔ کہاں تلک

۶ ہے سپردِ خاک حسرتؔ واں جو اک یارِ عزیز — قصد اک مدت سے ہم رکھتے ہیں گورکھپور کا

کے چکر لگاتے، پاکستان بھی ہو آتے، اور ممکن ہوتا تو مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ تک پہونچ جاتے، لیکن ایک حیرت انگیز امر یہ ہے کہ حسرت اس ہنگامہ آرائی کے باوجود ہمیشہ تنہا رہے، ان کو اپنا ہم خیال کبھی نہ ملا، وہ سیاسی جماعتوں میں شریک ہوتے لیکن اپنے آپ کو ہر جگہ تنہا پاتے، وہ شروع میں کانگرس کے ایک سرگرم رکن تھے لیکن کانگرس کی پالیسی ان کے خیالات کی تیز گامی کا ساتھ نہ دے سکی، وہ مسلم لیگ میں بھی شامل ہوئے لیکن انھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ قائد اعظم کی پالیسی سے وہ بہت آگے ہیں اور کوشش کے باوجود مسلم لیگ کو مکمل آزادی کے تصور سے ہم کنار نہ کر سکیں گے، وہ کمیونسٹ بھی تھے لیکن کم سے کم اس صوبہ کے کمیونسٹ پارٹی نے ان کی اہمیت کا بہت کم احساس کیا، مولانا کے فلسفہ میں چند متضاد باتیں ایسی جمع ہو گئی تھیں جن کو سلجھانا، اور سمجھنا کوئی آسان کام نہیں، تھے تو وہ پکے کمیونسٹ مگر آخر دم تک وہ نظام حیدرآباد کے بڑے مخلص اور سرگرم مددگار رہے، اور حتی الوسع اس امر کے کوشاں رہے کہ میر عثمان علی خاں اپنے عہدے پر اور اقتدار کے ساتھ قائم رہیں۔ شاید یہی وجہ ہو کہ حسرت کو عمر بھر تنہا زندگی بسر کرنا پڑی جس کی جانب مولانا سید سلیمان نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

"حسرت! رخصت!! تو تنہا آیا تھا، تنہا رہا، تنہا گیا۔۔۔۔۔۔" (نگار)

مولانا سودیشی تحریک کے رہبر تھے تو تنہا تھے۔ کانگرس میں مہاتما گاندھی جب ڈومینین اسٹیٹس قبول کرنے پر آمادہ تھے حسرت مکمل آزادی کا نعرہ بلند کرتے تھے، مسلم لیگ نے جب کامن ویلتھ میں شریک ہونے پر آمادگی کا اظہار کیا تو مولانا پھر تنہا نظر آنے لگے، "لیکن ہر سیاسی کیمپ کچھ جماعتی اغراض و مقاصد بھی رکھتا

ہے، وہاں انفرادی آزادی اور حق پرستی سے زیادہ جماعتی معاملہ فہمی کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے، حسرت اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے "یارانِ طریق" گوؤں کے نہ تھے۔ اس لئے ہر دور میں اور ہر مقام پر ہمیشہ تنہا رہے۔ وہ معاشی پریشانیوں میں ہمیشہ مبتلا رہے لیکن ان کی غیرت، ان کی حق نوائی اور اٹل قوت فیصلہ نے ان کو ہمیشہ جادۂ صواب پر قائم رکھا، اور وہ بلا خوف سماج اور مذہب کے مخلصانہ خدمتیں کرتے رہے۔"

(سید سلیمان ندوی)

تلک آنجہانی کے علاوہ مولٰنا ابتدائے زندگی میں آرو بندو گھوش پر عاشق تھے، مرحوم ان کی قابلیت، تدبر، اور دلیری کے بڑے مداح تھے، مدتوں ان کو یہ خیال رہا کہ وہ پانڈیچری کے حجرہ سے برآمد ہوں گے اور ہندوستان کی سیاست میں سرگرم عمل نظر آئیں گے، ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، آخر زمانہ میں ان کو یہی عقیدت بوس سے پیدا ہو گئی تھی، ان کا ایمان تھا کہ وہ اب تک زندہ ہیں اور وقت خاص پر ہندوستان کی سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں گے، مولانا سے ان کے درجنوں دوستوں اور شناساؤں نے اس موضوع پر بات چیت کی مگر مولٰنا کے ایمان میں کبھی تزلزل پیدا نہ ہو سکا۔ وہ خود مر گئے، لیکن بوس کی موت کا وہ کبھی یقین نہ کر سکے، یہی فرماتے رہے، وہ زندہ ہے، وہ ہندوستان کا نگرانِ حال ہے، وہ وقت کا انتظار کر رہا ہے اور مناسب وقت پر وہ نمودار ہوگا اور ہندوستان کی کایا پلٹ کر دے گا۔ حسرت کا یہ تصور عیسائیوں کے اس عقیدہ سے مشابہ ہے، ان کا بھی ایمان ہے کہ حضرت عیسٰی نمودار ہوں گے، اور خدا کی حکومت اکناف عالم میں قائم ہو جائے گی۔ یا پھر یہ کہ حضرت مہدی نمودار ہوں گے

اور دنیا بھر میں اسلام کا بول بالا ہوگا۔

ہمارے خیال میں حسرت کا یہ تصور اور یوسف سے ان کی یہ والہانہ عقیدت ایک نفسیاتی پس منظر رکھتی ہے، ان کو ہمیشہ ایک بلند مرتبہ اور نڈر سیاسی رہنما کی ضرورت محسوس ہوتی رہی، زندگی کے ابتدائی دور میں ان کو تلک اور گھوش سے عقیدت رہی زندگی کے آخری دور میں ان کے جذبۂ عقیدت کو پھر ایک ہیرو کی تلاش درپیش ہوئی، مہاتما گاندھی، سردار پٹیل، پنڈت نہرو اور قائد اعظم کو انھوں نے بار بار جانچا لیکن یہ اکابرین ان کے ہیرو نہ بن سکے، ان کا ہیرو بننے کے لئے سب سے اٹل اور نہایت ضروری وصف صرف ایک تھا، جو شخص انگریزی اقتدار کے استیصال کا جس قدر حامی تھا وہ حسرت کو اسی قدر محبوب تھا۔ نتائج اور عواقب کے خیال سے جو شخص جس قدر دور تھا اسی قدر وہ حسرت کے دل کے قریب تھا، اور چونکہ ان اکابرین نے برطانوی کامن ویلتھ میں شریک ہونے پر آمادگی ظاہر کی تھی اس لئے یہ حسرت کے دل سے دور ہو گئے تھے، جذبۂ عقیدت نے کئی دینی اور روحانی رہنماؤں سے مولانا کو وابستہ کر دیا تھا، سیاست میں انھوں نے یوسف کو اپنا پیشوا بنایا، اور زندگی کے آخری لمحہ تک وہ اسی ہیرو کے گن گاتے رہے اور دل کی پوری عقیدت کے ساتھ اس کی دلکش شخصیت سے محبت کرتے رہے کسی نے سچ کہا ہے عقیدت کی شدت آدمی کو بچہ بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس معمہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

> حسرت زندگی کے لئے ایک معمہ تھے، لیکن زندگی حسرت کے لئے معمہ نہ تھی، زندگی نے انھیں نہ سمجھا، لیکن انھوں نے زندگی کو خوب سمجھا ...... ان کی زندگی کامیاب زندگی نہیں تھی لیکن وہ اپنے آپ کو

کامیاب سمجھتے تھے کیونکہ کامیابی کا تصور ان کے نزدیک مختلف تھا، وہ زندگی کے روایتی قدروں کے قائل نہ تھے ان کے ذہنی شعور کے ہاتھوں نئی قدروں کی تخلیق ہوتی تھی، وہ نئی دنیائیں تعمیر کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ تنہا تھے لیکن ان کی یہ تنہائی ایک مستقل انجمن تھی" (نگار)

مولانا عمر بھر تنہا رہے لیکن زندگی کے روایتی قدروں سے نہ وہ مانوس ہو سکے اور نہ اُن سے سمجھوتہ کرنے پر کبھی آمادہ ہوئے۔ زندگی پر ان کو پورا اقتدار حاصل تھا، اس کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی حقیقت ان پر عیاں نہ ہو، اور جس کو پامال کرنے کو (بوقت ضرورت) وہ آمادہ نہ ہوں، زندگی کی روایتی قدروں کی تباہی مولانا کے در دولت پر جس قدر ہوئی ویسی شاید ہی کہیں اور ہوئی ہو، اور یہ اسی وجہ سے ہوا کہ حسرت نے نہ سیاست میں سمجھوتہ کو جائز سمجھا، اور نہ روزمرہ کی زندگی میں ایسی شدید انفرادی شخصیت ایک ٹل چٹان کی طرح جس پر سمندر کی موجیں مدتوں بے سود تھپیڑے مارتی رہتی ہیں، سیاست کے میدان میں اسی طرح منفرد رہتی جس طرح سماجی زندگی میں الگ تھلگ رہتی، جب خود زندگی حسرت پر خندہ زن ہو کر عاجز ہو گئی تو پھر مولانا نے اس پر قہقہہ مارنا شروع کئے، مگر مولانا کی گرفت کبھی ڈھیلی نہ ہوئی، کیا عجب کہ خود زندگی کو ان سے پناہ مانگنا پڑی ہو، جو شخص بصرہ سے انگلستان تک تیرنے پر آمادہ ہو جائے اور کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد اکھاڑے میں اتر کر بانک بنوٹ کے پینترے دکھانے لگے اس پر زندگی کو کیا جرأت ہو سکتی تھی کہ خندہ زن ہو، خیر، حسرت اور زندگی کا تعلق تو اختیاری نہ تھا جو اس تعلق پر کف افسوس ملا جائے، مگر حسرت اور غزل کا تعلق یقیناً اختیاری تھا،

اور یہ سوال کیا جا سکتا ہے (بقول رشید احمد صدیقی) شاعری اور غزل پر کیا گذری ہو گی کہ ان دونوں نے حسرت کو اختیار کیا...... مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ نہیں بھولنا چاہیئے،

"سید فضل الحسن حسرت موہانی کی زندگی کے واقعات پر نظر کر کے ان کی شان حضرت ابوذر صحابی کی سی نظر آتی ہے جن کی نسبت رسول اللہؐ نے فرمایا۔

"ابوذر سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی"

سچ یہ ہے کہ اس عہدِ پُر فریب میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی"...... (سید سلیمان ندوی) (نگار)

زندگی کے آخری دور میں ان کا قیام احاطہ کمال خاں (کان پور) میں تھا جہاں وہ ایک کرایہ کے مکان میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ فروکش تھے۔

فجر کی نماز سے فارغ ہو کر اپنی ڈائری لکھتے تھے جو گذشتہ ۳۰ سال سے بلاناغہ لکھی جاتی تھی اس کے بعد ناشتہ سے فارغ ہو کر آپ بازار تشریف لے جاتے اور صبح ۹ بجے تک ڈاکٹر معین الدین صاحب کے یہاں اخبار بینی کے لئے پہونچ جاتے۔ واپسی گیارہ بجے ہوتی۔ اس کے بعد ڈھائی تین بجے تک اخبارات اور کتب بینی کا مشغلہ جاری رہتا اور ہو بجے تک مسلم لائبریری پہونچ جاتے تھے۔ عصر کے قریب مکان پر واپسی ہوتی۔ مغرب سے قبل شام کا کھانا تناول

فرما لیتے اور پھر کتب بینی میں مصروف ہو جاتے اور تقریباً دس بجے تک سو جاتے تھے۔

یہ تھا روزانہ کا معمول، ہند کے اس نامور فرزند کا جو سیاست اور ادب و شاعری میں آپ اپنی مثال ہے۔ ایسے جلیل القدر ماہر سیاست ادیب اور شاعر کی ذات پر ہندوستان صدیوں ناز کرے گا جس نے ادب اور سیاست دونوں شعبوں میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ۱۹۵۱ء میں مختصر سی علالت کے بعد مولانا مرحوم کا لکھنؤ بمقام فرنگی محل انتقال ہوا، اور اپنے پیر و مرشد کے قریب دفن ہوئے۔ علالت کی شدت میں بھی مولانا مرحوم اسی طرح باہمت اور ثابت قدم رہے جیسے صحت کی حالت میں ہمیشہ رہتے تھے اور بکمال خندہ پیشانی سے انھوں نے اپنی جان کو جان آفریں کے حوالہ کیا۔

میں مولانا کا نہایت درجہ شکر گذار ہوں۔ انھوں نے بڑی ہی خندہ پیشانی سے مجھے اپنی لائف کے بارے میں مواد مرحمت فرما کر اپنے کلام کا انتخاب کر کے اس کتاب میں شامل کرنے کے لئے عنایت کیا تھا۔

انتخاب کلام

مولانا حسرتؔ موہانی کا اپنا کیا ہوا

تمام دیوانوں کا انتخاب

عاشقانہ

حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا

اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اُس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکون
دردِ دل اُس نے تو حسرتؔ اور دونا کر دیا

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بےحد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بےصبری ہے حسرتؔ خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

اشکِ عشق سے نکلیں جو تمہارے آنسو
دامنِ حال میں وہ لیتے لیجئے سارے آنسو

جلوۂ حسن سے رنگیں ہیں یا جو آنکھیں انکی
سُرخ نکلے ہیں اسی رنگ کے سارے آنسو

دیکھکر غیر کی محفل میں انھیں مستِ شباب
نہ ہوا ضبط نکل آئے ہمارے آنسو

عالمِ حسن میں ہیں نور کی نہریں جاری
یا رواں عارضِ جاناں کے کنارے آنسو

گریۂ شوق سے تر ہیں جو تمہاری آنکھیں
بن گئے ہیں فلکِ حسن کے تارے آنسو

ہے محبت سے سروکار ہمیں بھی حسرت
چشمِ جاناں میں یہ کرتے ہیں اشارے آنسو

اور تو پاس مرے ہجر میں کیا رکھا ہے
اک ترے درد کو پہلو میں دبا رکھا ہے

دل سے اربابِ وفا کا ہے بھلانا مشکل
ہم نے یہ ان کے تغافل کو سنا رکھا ہے

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں
شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

سخت بیدرد ہے تاثیرِ محبت کہ انھیں
بسترِ ناز پہ سوتے سے جگا رکھا ہے

آہ وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور
دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

کیا تامل ہے مرے قتل میں اے بازوئے یار
ایک ہی وار میں سر تن سے جدا رکھا ہے

اس کا انجام بھی کچھ سوچ لیا ہے حسرت
تو نے ربط ان سے جو اس درجہ بڑھا رکھا ہے

توڑ کر عہدِ کرم ناآشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جائیے

گر نگاہِ شوق کو محوِ تماشا دیکھیے
قہر کی نظروں سے مصروفِ سزا ہو جائیے

میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب
دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جائیے

مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جائیے

دلِ مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے
گدازِ غم اگر چاہے تو مجھکو باخدا کر دے

عطا ہو اس وفا دشمن کو توفیقِ کرم یارب
نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کر دے

تقاضا کر رہا ہو اب یہ حسنِ تازہ کاراں کا
کہ جس نے دل دیا تھا جان بھی ہم پر فدا کر دے

اثر ایسا کہاں سے لاؤں یارب نالۂ دل میں
جو اس بے مہر کو بھی رازِ غم سے آشنا کر دے

گراں گذرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر
نگاہِ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے

ہوا جاتا ہے نذرِ عشق پر دردِ ہوس غالب
الٰہی اصلِ حق سے لوثِ باطل کو جدا کر دے

غرورِ حسن کی تاثیر سے ڈر ہے مجھے حسرت
کہیں ایسا نہ ہو یہ عشق کو بھی خود نما کر دے

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں
کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا
ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

آہ وہ آنکھ جو بے مروت رہی صاعقہ پاش
وہ جو مجھ سے کسی عنوان ملائی نہ گئی

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی انکا
جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

دل کو تھا حوصلۂ عرضِ تمنا سو انھیں
سرگذشتِ شبِ ہجراں بھی سنائی نہ گئی

غمِ دوری نے کشاکش تو بہت کی لیکن
یاد ان کی دلِ حسرت سے بھلائی نہ گئی

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا
ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

تیرے اس التفات کا ہوں غلام | جو ہوا ابھی تو بر ملا نہ ہوا
کچھ عجب چیز ہے وہ چشم سیاہ | تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا
رو برو ان کے کچھ نہیں معلوم | کیا ہوا بیخودی میں کیا نہ ہوا
مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج | یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
تم جفا کار تھے کرم نہ کیا | میں وفا دار تھا خفا نہ ہوا
خود بخود بوئے یار پھیل گئی | کوئی منت کش صبا نہ ہوا
ہجر میں جانِ مضطرب کو سکوں | آپ کی یاد کے سوا نہ ہوا
رہ گئی تیرے قصرِ عشق کی شرم | میں جو محتاج اغنیا نہ ہوا

ہو گئے بے خود کلام حسرت سے
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

پیروِ مسلکِ تسلیم و رضا ہوتے ہیں | ہم تری راہِ محبت میں فنا ہوتے ہیں
شرم کر شرم کہ اے جذبۂ تاثیر وفا | تیرے ہاتھوں وہ پشیمانِ جفا ہوتے ہیں
چھیڑتی ہے مجھے بیباکی خواہش کیا کیا | جب کبھی ہاتھ وہ پابندِ حنا ہوتے ہیں
نہ اثر آہ میں کچھ ہے نہ دعا میں تاثیر | تیر ہم جتنے چلاتے ہیں خطا ہوتے ہیں
اہلِ دل سنتے ہیں اک سازِ محبت کی نوا | ہم تری یاد میں جب نغمہ سرا ہوتے ہیں
لذتِ درد نہ کیوں اہلِ ہوس پر ہو حرام | کہ وہ کمبخت طلب گارِ دوا ہوتے ہیں

جسم ہوتا ہے جدا جان سے گویا حسرت
آسماں ان سے چھڑاتا ہے جدا ہوتے ہیں

سر یہ حاضر ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو | کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

دانشِ بخت ہے پیدائشِ شوق کا نام ۔۔۔ لوگ دیوانہ نہ سمجھیں ترے دیوانے کو
بھول جاؤں میں انھیں یہ ہو نہیں سکتا ناصح ۔۔۔ آگ لگ جائے تو ظالم ترے سمجھانے کو
دیکھ لیں شمع کو تاثیرِ وفا کے منکر ۔۔۔ جل بجھی خود بھی جلایا تھا جو پروانے کو
فرقتِ یار بھی گھنگھور اٹھی ہے جو گھٹا ۔۔۔ اشک خوں آنکھ بھی آمادہ ہے برسانے کو
دل یہ کہتا ہے میں ہوں اور محبت کا غلام ۔۔۔ جس نے آباد کیا ہے مرے ویرانے کو
روح کہتی ہے مری جان ہے وہ نورِ جمال ۔۔۔ کر دیا جس نے منور مرے کاشانے کو

برق کا قول مجھے یاد ہے ابتک حسرت
زندگی کہتے ہیں دنیا سے گزر جانے کو

روز و شب رویا کئے شام و سحر رویا کئے ۔۔۔ رونے والے تیرے تجھکو عمر بھر رویا کئے
بیوفائی سب سے کر کے تو نے دی دادِ وفا ۔۔۔ تیری اس ہمت پہ تیرے نوحہ گر رویا کئے
خاکساری میں بھی تیری وضعداری کا تھا رنگ ۔۔۔ یعنی ہم اس سے بھی کر کے درگزر رویا کئے
کچھ خبر ہے تجھ کو اے آسودۂ خوابِ لحد ۔۔۔ شب جو تیری یاد میں ہم تا سحر رویا کئے
تیرے جیتے جی نہ جانی قدر تیری اے عزیز ۔۔۔ اپنی اس تقصیر پر ہم کس قدر رویا کئے

برق کے مرنے کا حسرت واقعہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ اگر ہم عمر بھر رویا کئے

آپ مختار کچھ نہ کی دل کی ۔۔۔ اڑ گئی مفت میں ہنسی دل کی
یاد ہر حال میں رہے وہ مجھے ۔۔۔ الغرض بات رہ گئی دل کی
مل گئی ہم کو ان سے دادِ وفا ۔۔۔ جو نہیں جانتے لگی دل کی
ان سے کچھ تو ملا وہ غم ہی سہی ۔۔۔ آبرو کچھ تو رہ گئی دل کی

مر مٹے ہم نہ ہو سکی پوری — آرزو تم سے ایک بھی دل کی

وہ جو بگڑے رقیب سے حسرت
اور بھی بات بن گئی دل کی

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا — اب تو اظہارِ محبت بر ملا ہونے لگا
کیا کیا میں نے جو ناحق تم خفا ہونے لگے — کچھ سنا بھی یا کہ یوں ہی فیصلا ہونے لگا
اب غریبوں پر بھی ساقی کی نظر پڑنے لگی — بادۂ پس خوردہ ہم کو بھی عطا ہونے لگا
میری رسوائی سے شکوہ ہے یہ ان کے حسن کو — اب جسے دیکھو وہ میرا مبتلا ہونے لگا
کچھ نہ پوچھو حال کیا تھا خاطرِ بیتاب کا — ان سے جب مجبور ہو کر میں جدا ہونے لگا
شوق کی بیتابیاں حد سے گذر جانے لگیں — وصل کی شب وا جو وہ بندِ قبا ہونے لگا
غیر سے مل کر انھیں ناحق ہوا میرا خیال — مجھ سے کیا مطلب بھلا میں کیوں خفا ہونے لگا

کیا ہوا حسرت وہ تیرا ادعائے ضبطِ غم
دو ہی دن میں رنجِ فرقت کا گلا ہونے لگا

ہر دل میں اک ہجومِ محبت ہے آجکل — اس شوخ کی کچھ اور ہی صورت ہے آجکل
اے سحرِ حسنِ یار میں اب تجھ سے کیا کہوں — دل کا جو حال تیری بدولت ہے آجکل
شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھکو کہ اور بھی — تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آجکل
مستور کس حجاب میں ہے وہ جمالِ پاک — اہلِ نظر کو جس سے عقیدت ہے آجکل
برپا ہے بزمِ یار میں اک حشرِ آرزو — اظہارِ شوق کی جو اجازت ہے آجکل
اک طرفہ بیخودی کا ہے عالم کہ عشق میں — تکلیف آجکل ہے نہ راحت ہے آجکل
ساقی سے فصلِ گل میں کہیں کیوں سوالِ مے — کیا التماس کی بھی ضرورت ہے آجکل

پرتاب گڈھ میں ہم کو تری یاد کے سوا
حاصل ہر ایک شغل سے فرصت ہے آجکل

حسرت وہ سوز خاص جو ہو حاصل فراق
تیرے سخن میں اس کی بھی لذت ہے آجکل

اس تغافل پر بھی کرتے ہیں تجھی کو یاد ہم
کتنے ہیں مجبور دیکھ اے بانیٔ بیداد ہم

عقل کب آئی ہمیں جب ہو چکا ناکام دل
رحم کب آیا انھیں جب ہو چکے برباد ہم

آئے تھے محفل میں تیری با ہزاراں آرزو
یاں چلے ہیں ایک لیکن خاطر ناشاد ہم

جاتے ہیں پرتاب گڑھ آخر الہ آباد سے
جس طرح جھانسی سے آئے تھے الہ آباد ہم

ہر طرف پیش نظر ہے وہ جمال دلفریب
دیکھتے ہیں یوں بہار گلشن ایجاد ہم

قید تنہائی میں بھی تنہا نہیں اے یاد یار!
آج یہ عقدہ کھلا ہم پر کہ ہیں آزاد ہم

مار ڈالا مجھ کو حسرت یوں ہی جب اس نے کہا
مانتا ہوگا نہ تجھے کرتے ہیں جو ارشاد ہم

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سر بام کہیں
جلد اے حوصلۂ دید مجھے تھام کہیں

بزم ساقی کا یہ کیا حال ہوا میرے بعد
خم کہیں ہے تو صراحی ہے کہیں جام کہیں

آہ کہنا وہ ترا پا کے مجھے گرم نظر
ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ کہ یہ انداز ہے کیا
قصد ان کا ہے کہیں جانے کا پیغام کہیں

رنج بے سود سے حاصل ہو یونہی کاش نجات
راہ ہی ڈالے ہیں وہ بت خود کام کہیں

مجھ کو مشتاق لقا جان کے کہتا ہے وہ شوخ
بر نہ آئی ہو یہ تیری ہوس خام کہیں

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرت
آپ جاتے ہیں جو روزانہ سر شام کہیں

کیوں جانِ رضا جو نہ شہادت پہ فدا ہو   کیوں اس کو نہ چاہے گا بھلا تم جسے چاہو
دل غم سے جو کھٹکتا ہے محبت کا بُرا ہو   ایسے میں تری یاد بھی آجائے تو کیا ہو
پاس آؤ تو کچھ دل کی تپش اور سوا ہو   ہر چند کہ تم دردِ جدائی کی دوا ہو
دل ہم نے دیا آپ کو اب اس کا نتیجہ   قسمت پہ ہے موقوف برا ہو کہ بھلا ہو
تھے پاس تو منظورِ نظر راحتِ دل تھے   اب جانِ تمنا ہو جو تم ہم سے جدا ہو
رنج شبِ غم میں بھی ملے وصل کی راحت   گر دل میں ترے دردِ محبت کا مزا ہو

مرتا ہے کسی شوخ جفا کار پہ حسرت
شاید یہ فسانہ کہیں تم نے سنا ہو

چھپ کے اس نے جو خود نمائی کی   انتہا تھی یہ دلربائی کی
مائل غمزہ ہے وہ چشمِ سیاہ   اب نہیں خیر پارسائی کی
ہم سے کیونکر وہ آستاں نہ چھٹے   مدتوں جس پہ جبہہ سائی کی
دام سے ان کے چھوٹنا تو کہاں   یاں ہوس بھی نہیں رہائی کی
ہو گئے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش   صلح میں شان ہے لڑائی کی

اس تغافل شعار سے حسرت
ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا   شیوۂ عشق نہیں حسن کا رسوا کرنا
اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحتِ جاں   کچھ بھی دشوار نہ تھا مجھ کو شکیبا کرنا
ان کو یاں وعدے پہ آنے تو دے اے ابرِ بہار   جس قدر چاہنا پھر بعد میں برسا کرنا

شام ہو یا کہ سحر یاد انھیں کی رکھنی — دن ہو یا رات ہمیں ذکر انھیں کا کرنا
صوم زاہد کو مبارک رہے عابد کو صلوٰۃ — عاصیوں کو تری رحمت پہ بھروسا کرنا
عاشقو حسنِ جفاکار کا شکوہ ہے گناہ — تم خبردار خبردار نہ ایسا کرنا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت
ان سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنّا کرنا

نظر پھر نہ کی اس پہ دل جس کا چھینا — محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا
وہ کیا قدر جانیں دلِ عاشقاں کی — نہ عالم نہ فاضل نہ دانا نہ بینا
یہ کیا کفرِ نعمت ہے اے شیخ آخر — کہ برسات میں بھی بلانا نہ پینا
وہیں سے یہ آنسو رواں ہیں جو دل میں — تمنّا کا پوشیدہ ہے اک خزینا
یہ کیا قہر ہے ہم پہ یارب کہ بے مے — گزر جائے ساون کا یوں ہی مہینا
بہار آئی سب شادماں ہیں مگر ہم — یہ دن کیسے کاٹیں گے بے جام و مینا

مٹے عیب سب عشق بازی میں حسرت
نہ بغض و حسد ہے نہ غصّہ نہ کینا

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم — گھبرا گئے ہیں بیدلی ہمرہاں سے ہم
اے یادِ یار دیکھ کہ باوصفِ رنجِ ہجر — مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم
معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدعا — اب تم سے دل کی بات کہیں کیا زباں سے ہم
اے زہدِ خشک تیری ہدایت کے واسطے — سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم
بیتابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو — آخر بچے نہ اس نگہ بدگماں سے ہم
پیرانہ سر بھی شوق کی ہمت بلند ہے — خواہانِ کام جاں ہیں جو اس نوجواں سے ہم

خلعت بنے گی تیرے غمِ جاں نواز کی | لیں گے یہ کام اپنے دلِ شادماں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق | پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی
اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

ان سے مل کر شکوۂ بے اعتنائی پھر کہاں | شاد رہ اے دل کہ یہ لطفِ جدائی پھر کہاں
اب بھی ہیں اہلِ ہوس نا قدر دانِ شانِ حسن | لے چلا ہے ان کو شوقِ خود نمائی پھر کہاں
سب ہماری زندگی ہی تک ہیں ان کے حوصلے | ورنہ یہ ناز و غرورِ دلربائی پھر کہاں
شوق ہو کامل تو کیسا جذبِ خوباں کا گلہ | باوفا ہم ہوں تو رنجِ بے وفائی پھر کہاں
شرط ہے اک بار پڑ جانا تمہارے عشق میں | اس طلسمِ غم سے امیدِ رہائی پھر کہاں

لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذتِ آغازِ عشق
اس ستم گر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں

لبِ یار شکر فشاں ہو رہا ہے | شکارِ دلِ دوستاں ہو رہا ہے
بہت آج وہ مہرباں ہو رہے ہیں | مرے ضبط کا امتحاں ہو رہا ہے
حسینوں پہ جانیں فدا ہو رہی ہیں | وفا وعدۂ عاشقاں ہو رہا ہے
میں اب کیا کہوں تجھ سے بات اپنے دل کی | کہ تو بے کہے بدگماں ہو رہا ہے

جسے درد جانا تھا ہم نے وہ حسرت
محبت میں درمانِ جاں ہو رہا ہے

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم | ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا | وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم

دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم
جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت
سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

اور بھی ہو گئے بیگانہ وہ غفلت کر کے آزمایا جو انھیں ضبطِ محبت کر کے
دل نے چھوڑا ہے نہ چھوڑے ترے ملنے کا خیال بارہا دیکھ لیا ہم نے ملامت کر کے
پستیٔ حوصلۂ شوق کی اب ہے یہ صلاح بیٹھ رہیے غمِ ہجراں پہ قناعت کر کے
دل نے پایا ہے محبت کا یہ اعلیٰ رتبہ آپ کے دردِ دل آزار کی خدمت کر کے
روح نے پائی ہے تکلیفِ جدائی سے نجات آپ کی یاد کو سرمایۂ راحت کر کے

چھیڑ سے اب وہ یہ کہتے ہیں کہ سنبھلو حسرت
صبر و تابِ دلِ بیمار کو غارت کر کے

لطف کی ان سے التجا نہ کریں ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
مل رہے گا جو ان سے ملنا ہے لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں
صبر مشکل ہے آرزو بیکار کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں
مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

شوق ان کا سو لٹ چکا حسرت
کیا کریں ہم اگر وفا نہ کریں

نامرادوں کو شاد کام کرو کرم اپنا کبھی تو عام کرو
کارِ عاشق ہے ناتمام سو تم قتل کر کے اسے تمام کرو

سب کی خاطر کا ہے خیال تمہیں — کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
کھل سکے جب تلک نہ راہِ مراد — منزلِ صبر میں قیام کرو

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو

اگر شوق کی رہنمائی نہ ہوگی — تو اُن تک ہماری رسائی نہ ہوگی
شبِ ہجر کیونکر کٹے گی جو یارب — تصوّر کی راحت فزائی نہ ہوگی
بغیر اُن کے دم بھر نہیں چین دل کو — کبھی اُن سے گویا جدائی نہ ہوگی
پڑے گی نظر تیری کاہے کو ہم پر — اگر بر سرِ دلربائی نہ ہوگی
خرد کے لئے مایۂ فخر ہوگا — دیارِ جنوں کی گدائی نہ ہوگی
رہے عشق سے روح مانوس ہو کر — اب اس دامِ غم سے رہائی نہ ہوگی
ترا وہم ہوگا سرِ بزم ہم نے — کبھی آنکھ تجھ سے لڑائی نہ ہوگی
وہ بگڑے ہیں تو ہم بھی جائیں گے آخر — لڑائی ہوئی ہے صفائی نہ ہوگی

ستم کر کے ناحق وہ نادم ہیں حسرت
کہ ہم سے کبھی بے وفائی نہ ہوگی

ترے درد سے جس کو نسبت نہیں ہے — وہ راحت مصیبت ہے راحت نہیں ہے
جنونِ محبت کا دیوانہ ہوں میں — مرے سر میں سودائے حکمت نہیں ہے
ترے غم کی دنیا میں اے جانِ عالم — کوئی روح محرومِ راحت نہیں ہے
مجھے گرمِ نظارہ دیکھا تو ہنس کر — وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے
ترے سرفروشوں میں ہے کون ایسا — جسے دل سے شوقِ شہادت نہیں ہے

شہیدانِ غم ہیں سبک روح کیا کیا
کہ اس دل پہ بارِ ندامت نہیں ہے
نمونہ ہے تکمیلِ حسنِ سخن کا
گہرباریِ طبعِ حسرت نہیں ہے

بجا ہے دلِ زار کی ناصبوری
کہاں تک اٹھائے کوئی رنجِ دوری
رعایت جو اس شوخ کی تھی ضروری
خطا بن گئی خود مری بے قصوری
وہ تمہید ہی سے اڑا لیں گے مطلب
کہیں شوق نے کی نہ ہو بات پوری
محبت نے کی دل میں وہ آگ روشن
کہ ہم ہو گئے جسمِ خاکی سے نوری
بہر حال گرویدۂ حسن ہیں ہم
جمالِ بشر معنوی ہو کہ صوری
تمنا نے کی خوب نظارہ بازی
مزا دے گئی حسن کی بے شعوری
نہ چھوٹا درِ یار حسرت نہ چھوٹے
بہت ہم نے چاہا نہیں کا نفوری

ہوائے برشگالی ہے ہوس خیز
کرے کوئی کہاں تک اس سے پرہیز
تبسم ہے ترا اے شاہِ خوباں
سراسر اک تماشائے دل آویز
یہاں دل کارگاہِ آرزو ہے
وہاں ہے نازِ حسنِ یار نوخیز
فسونِ طرفہ ہے حرفِ لبِ یار
گہے شکر شکن گاہے نمک ریز
سب اس کو درد ہم کہتے ہیں ورنہ
اذیت بھی ہے جس کی راحت آمیز
نہیں اب تک حواسِ عقل برجا
شرابِ عاشقی تھی کس قدر تیز
مجھے فیضِ سخن پہنچا ہے حسرت
ز روحِ پاکِ شمس الدین تبریز

اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو
پھیلے جاتے ہیں رُخِ یار پہ سارے گیسو

نورِ ایماں کے معاون ہیں تمہارے عارض
کفرِ عشاق کے حامی ہیں تمہارے گیسو

اہلِ شوق مجھے پا کے وہ بولے ہنس کر
دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو

ظلمتِ زلف سے نورِ رُخِ خوباں نہ دبا
جیتا عارض کی ہوئی شرط میں ہارے گیسو

فلکِ حسن پہ ہے ناز کے تاروں کی نمود
تابعِ زینتِ افشاں ہیں تمہارے گیسو

فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ
پہلے کس ناز سے رو رو کے سنوارے گیسو

کس قدر دشوار تھی ہم پر جدائی آپ کی
بارے پھر اللہ نے صورت دکھائی آپ کی

بدگماں کاہے کو ہوتا آپ کا حسنِ غیور
ہم نے کیوں تصویر آنکھوں سے لگائی آپ کی

نے نوازِ عاشقی نے نغمہائے حسن میں
بارہا آواز کانوں کو سنائی آپ کی

بھول بیٹھے تھے الٰہی کیا کریں اس دل کو ہم
ہجر میں پھر یاد جس دل نے دلائی آپ کی

ربط جب دیکھا کہ غیروں سے بڑھایا آپ نے
رفتہ رفتہ ہم نے بھی چاہت گھٹائی آپ کی

جس سے حسرت ہو گئی زیر و زبر بزمِ سماع
کس قیامت کی غزل مطرب نے گائی آپ کی

کوچہ اُس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا
دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا

پردہ ہم سے جو وہ کرتے تھے نہ کرنے پائے
شوقِ بیباک نے اس کو بھی اٹھا کر چھوڑا

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

تجھ سے ملنے پہ کسی کی ہمیں پروا نہ رہی
سب کو دنیا میں تری یاد لگا کر چھوڑا

مرگِ حسرت کا بہت رنج کیا آخرکار
اثرِ عشق نے ان کو بھی رلا کر چھوڑا

نہ لیکر دل کرو انکار دل کا
کہ چھپتا ہی بہت دشوار دل کا

پھر ان سے بعد مدت کیوں ملے ہم
جنوں پھر ہو گیا بیدار دل کا

یوں ہی ثابت رہو تم داغ پر داغ
پھلا پھولا رہے گلزار دل کا

ندامت کیوں نہ ہوتی ان سے ہر بار
کہا ہم نے کیا ہر بار دل کا

ہوئے ہیں جب سے دونوں ان کے حسرت
نہ دل میرا نہ میں ہوں یار دل کا

انھیں شوق خود آرائی نہ ہوتا
تو اتنا دل بھی سودائی نہ ہوتا

تغافل مجھ سے کیوں کرتے خود ان کو
اگر دعوے زیبائی نہ ہوتا

تری بدنامیوں کا ڈر ہی ہو ورنہ
ہمیں کچھ خوف رسوائی نہ ہوتا

نہ ہوتے ان کے ہم عاشق تو شاید
انھیں بھی ناز یکتائی نہ ہوتا

جفا بیشک وہ کم کرتے جو حسرت
ستم جزو دل آرائی نہ ہوتا

تیر ناز آئے تو ان کا آزمانے کے لئے
پیش کرتے ہیں دل اپنا نشانے کے لئے

میں کبھی خوش میرا خدا بھی خوش ہو تیرے درد کو
درد گو وجہ مصیبت ہے زمانے کے لئے

چھیڑ اگر منظور ہے ان کو تو باوصف حجاب
پھر وہ دیکھیں گے مجھے پھر مسکرانے کے لئے

چھوڑ کر وہ چل نہ دیں آخر ز راہ انتقام
مجھ کو تنہا رات دن آنسو بہانے کے لئے

وہ کہیں پوچھے تو حسرت کس پہ مرتے ہو کہ تم
نام تک تیار ہیں اس کا بتانے کے لئے

قسمت شوق آزما نہ سکے
ان سے ہم آنکھ بھی ملا نہ سکے

ہم سے یاں رنجِ ہجر اُٹھ نہ سکا — واں وہ مجبور تھے وہ آ نہ سکے
ہم سے دل آپ نے اُٹھا تو لیا — پر کہیں اور بھی لگا نہ سکے
اب کہاں تم کہاں وہ ربطِ وفا — یاد بھی جس کی ہم دلا نہ سکے

ہم تو کیا بھولتے انھیں حسرت
دل سے وہ بھی ہمیں بھلا نہ سکے

وجہ کیا خواب میں نہ آنے کی — شرم انھیں ہو نہ روٹھ جانے کی
غیر ممکن ہے تیرے بعد ہوس — دل کسی اور سے لگانے کی
سرمۂ چشمِ عیش تھی بخدا — خاک تیرے غریب خانے کی
مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے تجھے — سختیاں خود بخود زمانے کی
اب نہ دل ہے نہ وہ ذخیرۂ شوق — توڑ دوں کنجیاں خزانے کی

ان کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرت
دلفریبی ترے فسانے کی

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر — آرزوئے زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں — دل پہ ذوقِ شاعری اک بار ہے تیرے بغیر
شرکتِ بزمِ سخن سے بھی ہمیں باوصفِ عزم — بر بنائے بیدلی انکار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے — اب وہ حاصل ہو تو اک آزار ہے تیرے بغیر

دردِ دل جو تھا کبھی وجہِ مباہات و شرف
بہرِ حسرت موجبِ صد عار ہے تیرے بغیر

کب یہ کہتے ہیں کہ ہم تیرے گنہگار نہیں — ہاں مگر اتنی جفا کے بھی سزاوار نہیں

میرے اظہارِ ندامت کو پشیمان گیا — اب نہ کہنا کہ ہمیں رحم سے انکار نہیں
عقل بھی اصل میں اک شعبۂ حیرانی ہے — ہوشیاری ہے یہی میری کہ ہشیار نہیں
نہ سہی آپ جفا سے جو نہیں باز آتے — جائیے جائیے اب ہم کو بھی اصرار نہیں

خرمیٔ شوقِ شہادت کو مبارک حسرت
مجھ کو ابرام ہے اس شوخ کو انکار ہے

مضطر ہے بہت میری طبیعت کئی دن سے — دیکھی جو نہیں آپ کی صورت کئی دن سے
میخانے سے محروم چلے آتے ہیں یوں ہی — ہوتی نہیں ساقی کی عنایت کئی دن سے
چھیڑے ہے مجھے پھر خلشِ خارِ محبت — بے چین ہے پھر میری طبیعت کئی دن سے
مجھ سا بھی نہ ہو محوِ تصور کوئی یعنی — ملتی نہیں رونے کی بھی فرصت کئی دن سے
کہتے ہیں جنوں بیخودیٔ شوق کو احباب — سودائے ہو گیا کیا مری حیرت کئی دن سے
کس فتنۂ محشر نے کیا وصل سے انکار — برپا ہے مرے دل میں قیامت کئی دن سے

ہے ناک میں دم اور بھی بے چین ہوں حسرت
کرتے ہیں جو احباب نصیحت کئی دن سے

دل ہے نازاں کہ تری صورتِ زیبا دیکھی — آنکھ حیراں کہ اک حسن کی دنیا دیکھی
پہلے آنکھیں ہوئیں گرویدہ پھر آنکھوں کی طرح — چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی
بدگماں مجھ سے بھی کیوں غیر کے مانند ہوئے — مجھ کو دیکھا نہ مرے دل کی تمنا دیکھی
فطرتِ حسن ہے بیباک مگر ہم نے یہاں — تیری شوخی میں بھی اک شانِ محابا دیکھی

زلفِ شبرنگ پہ گلنار لباسی کی بہار
آج حسرت نے رخِ یار میں کیا کیا دیکھی

جہاں تک انھیں ہم بھلاتے رہے ہیں
وہ کچھ اور بھی یاد آتے رہے ہیں

انھیں حالِ دل ہم سناتے رہے ہیں
وہ خاموش گیسو بناتے رہے ہیں

محبت کی تاریکیٔ یاس میں بھی
چراغِ ہوس جھلملاتے رہے ہیں

جفا کار کہتے رہے ہیں جنھیں ہم
انھیں کی طرف پھر بھی جاتے رہے ہیں

وہ سوتے رہے ہیں الگ ہم سے جب تک
مسلسل ہم آنسو بہاتے رہے ہیں

بگڑ کر جب آئے ہیں ان سے تو آخر
انھیں کو ہم اُلٹے مناتے رہے ہیں

وہ سنتے رہے مجھ سے افسانۂ غم
مگر یہ بھی ہے مسکراتے رہے ہیں

آشنا جب سے وہ بدخو وہ ستمگار ہوا ——— فتنہ بیدار ہوا
جانِ دل سے ہوئی دل جاں سے بیزار ہوا ——— صبر دشوار ہوا

اب نہ دنیا کی تمنّا ہے نہ عقبیٰ کی ہوس ——— اک تری یاد ہے بس
دل جو اب جانِ جہاں تیرا طلبگار ہوا ——— سب سے بیزار ہوا

دل کو حاصل ہوئی افکار دو عالم سے نجات ——— بن گئی خوب یہ بات
چھٹ گئے سب سے تیری قید کا اصرار ہوا ——— اور با صرار ہوا

بے وفائی کا جو خطرہ تھا وہ پیش آ کے رہا ——— تجھ سے اے محوِ وفا
لطف کا شکوۂ غم پر بھی نہ اظہار ہوا ——— صاف انکار ہوا

ہم نے حسرت کی سفارش تو بہت کی تھی مگر ——— نہ ہوا کچھ بھی اثر
پہلے بیگانہ جو تھا اب وہ دل آزار ہوا ——— یار اغیار ہوا

حسرتؔ موہانی

تو ہی دلِ شاد ماں دلِ پارسا دل — ترے عاشق نے بھی پایا ہو کیا دل
لگا دو آگ عذرِ مصلحت کو — کہ ہو بیزارِ دانش ہائے سہرا دل
جفا کاری ہے تسلیمِ ستم بھی — نہ ہوگا تابعِ جور و جفا دل
غلط ہے قولِ عقلِ مصلحت کوش — نہ اس جانب کرے گا اعتنا دل
لگا کر آنکھ اس جانِ جہاں سے — نہ ہوگا اب کسی سے آشنا دل
مٹے افکارِ گوناگوں کے جھگڑے — ترے غم کو نہ دے کیونکر دعا دل

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرتؔ
بڑی اُمید ہے میری بڑا دل

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
شغل بیکار ہیں سب ان کی محبت کے سوا

حشر میں تابِ جہنم سے مفر اور کہاں
اہلِ عصیاں کو ترے سایۂ رحمت کے سوا

علم و حکمت کا جنہیں شوق ہو آئیں نہ ادھر
کچھ نہیں فلسفۂ عشق میں حیرت کے سوا

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا
کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرتؔ کے سوا

عارفانہ

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

دل ہے بیشک نورِ حق سے فیضیاب
"آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"
شوقِ مے کی پرورش کیونکر نہ ہو
لطفِ ساقی آجکل ہے بیحساب
بے ترے اے بادشاہِ مہوشاں
خانۂ جانِ عزیزاں ہے خراب
پی جو ان آنکھوں سے کچھ صہبائے حسن
پھوٹ نکلا ہے وہی رنگِ شراب
عشق حسرت ہے نشانِ حسنِ دوست
بے گلاب آتی نہیں بوئے گلاب

ہو کر ہی رہا ہمیشہ میرا چاہا
جب جو مرے دل نے اس سے چاہا چاہا
توفیق اسے کہتے ہیں کہ جب بھی وہی
میں نے جو کچھ اسنے مجھکو دینا چاہا

نہ کسی سے دشمنی ہے نہ کسی سے آشنائی
وہ جہاں سے منہ کو موڑا تری یاد کیا لگائی
مجھے صوم سے ملا کچھ نہ نماز راس آئی
صنما رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسمِ پارسائی

گرویدہ اہلِ شوق جو حسنِ بتاں کے ہیں
شاید یہ سب نشان اسی بے نشاں کے ہیں
اب دل میں ہے کہ صرف ترے ہو کے بیٹھ جائیں
قصے چکا کے سب جو زمین و زماں کے ہیں
اب یہ بھی ہے قریب کہ مٹ جائیں یک قلم
سینے میں داغ جتنے غمِ دلبراں کے ہیں

حسرت وہ سُن رہے ہیں جو اہلِ وفا کا حال
اس میں بھی کچھ فریب تری داستاں کے ہیں

صلوٰۃ شوق بقدرِ جمالِ یار نہیں
چمن کا حُسن باندازۂ بہار نہیں

ترے کرم کا سزاوار اللہ زینہار نہیں
وہ تن کہ خستہ نہیں ہے وہ دل کہ زار نہیں

ہر اُس نفس کو ہم اپنے کہیں گے ننگِ مراد
جو اُن کے اُنس کی خوشبو سے مشکبار نہیں

وہ عشق عشق نہیں ہے نہ جو پوشیدہ
وہ حُسن حُسن نہیں جو نقاب دار نہیں

ہزار شکر کہ مستغنیِ شفا ہو کر
مری عطا بھی ترے غم سے شرمسار نہیں

بجا ہے گر تری نسبت سے جانِ حسرت کو
ترے فراق کا صدمہ بھی ناگوار نہیں

فاسقانہ

یہ آج ہم سے جو چاہت جتائی جاتی ہے
عدو سے ملنے کی خفت مٹائی جاتی ہے

غضب ہیں آپ سے سرگوشیاں ندیموں کی
وہ بات کیا ہے جو ہم سے چھپائی جاتی ہے

وفورِ حسن سے ٹھہری کبھی ہو جب ان پہ نظر
یہ مجھ پہ مفت میں تہمت لگائی جاتی ہے

جنونِ عشق کا اظہار ہو ہی جاتا ہے
اڑی تو پھر یہ خبر کب دبائی جاتی ہے

پڑی تھی بزمِ رقیباں میں ایسی کیا افتاد
کہ بات بھی نہیں تم سے بنائی جاتی ہے

نہ مجھکو اُس کی خبر ہے نہ خود انھیں ہے خیال
کچھ اس طرح سے محبت بڑھائی جاتی ہے

دوچار ہو نظرِ شوق اُس سے کیا حسرت
نگاہِ یار تو دل میں سمائی جاتی ہے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اُٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں دکھانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا
وہ ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردہ کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچکر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
آج تک نظروں میں ہو وہ صحبتِ رازونیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گذریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

باوجودِ ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہد ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

پردے سے اک جھلک وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
ملنے کی ان سوا کبھی صورت نہ بن پڑی
سامانِ سودے دلِ ناداں کے رہ گئے
ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے انھیں
کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے
بیباک تھا زبسکہ مرا اضطرابِ شوق
شرما کے وہ کبھی کبھی جھنجلا کے رہ گئے
پہلے تو خون میرا بہایا خوشی خوشی
پھر کیا وہ خود ہی سوچ کے پچھتا کے رہ گئے

دعوئے عاشقی ہے تو حسرت کرو نباہ
یہ کیا کہ ابتدا ہی میں گھبرا کے رہ گئے

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب
اس غم سے ہم کو نیند نہ آئی تمام شب
کی پاس سے ہوس نے لڑائی تمام شب
تم نے تو خوب راہ دکھائی تمام شب
بیباک ملتے ہی جو ہوئے ہم تو شرم سے
آنکھ اس پری نے پھر نہ ملائی تمام شب
دل خوب جانتا ہی کہ تم کس خیال سے
کرتے رہے عدو کی برائی تمام شب

پھر شام ہی سے کیوں وہ چلے تھے چھڑا کے ہاتھ
دکھتی رہی جو ان کی کلائی تمام شب

حسرت سے کچھ وہ آتے ہی ایسے ہوئے خفا
پھر ہو سکی نہ ان سے صفائی تمام شب

شوق پر اب تک نہیں ثابت دکھائی آپ کی
کس قدر ہشیار ہے بے اعتنائی آپ کی

شوق کو مجبور ہو کر چھوڑ دینا ہی پڑا
جب کلائی نازکی سے تھرتھرائی آپ کی

آپ کو اس کی خبر کیا آپ تھے مصروفِ خواب
رات بھر زنجیرِ در کس نے ہلائی آپ کی

آپ کے وعدے کی شب کھا کر فریبِ آرزو
سیج کس کس شوق سے ہم نے سجائی آپ کی

رشک سے مٹ مٹ گئے ہم دیکھ کر گرمِ نظر
غیر نے محفل میں جب انگلی دبائی آپ کی

گلشنِ امید میں چلنے لگی بادِ مراد
یا سواری میرے دروازے پہ آئی آپ کی

سادگی ظاہر کی ہے باطن ہیں کتنے ہوشیار
بھید کی بات آج تک ہم نے نہ پائی آپ کی

کس قدر ہمدردِ غم ہے لوٹ کر بادِ شمال
جب چمن سے آئی بوئے حسن لائی آپ کی

حسرت اس کوچہ کا پھیرا روز کا اچھا نہیں
رنگ لائے گی کسی دن یہ گدائی آپ کی

محبوب ہیں محبوب کی ہر بات بجا ہے
اب مجھ سے تغافل بھی وہ فرمائیں تو کیا ہے

پھر شکوۂ غم کا مجھے کیوں شوق ہوا ہے
پھر ہنس کے وہ کہہ دیں گے یہی تیری سزا ہے

ہم خوش ہیں بہر حال جفا ہو کہ وفا ہو
وہ یوں کہ محبت کی سزا میں بھی مزا ہے

سونگھی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں
اب تک یہ اسی بوئے گریباں کا نشا ہے

کہنے کو تو ظاہر میں خفا ہم بھی ہیں لیکن
کچھ دل کا عجب حال ہے جب سے وہ خفا ہے

ہم چھین کے لے بھی گئے پان آپ کے منہ کا
کہتے ہی رہے آپ کہ دیں گے نہ دیا ہے

شرما گئے وہ بولے بھی تو کیا ہم سے نہ بولے
کیا خوب تری چھیڑ کا حسرت یہ صلا ہے

بازار ہے گو غرب میں خوبانِ جہاں کا — پر گل کی طرح حسن بھی کم بو ہے یہاں کا
غمزے میں وہ فطرت ہے نہ وہ ناز میں گرمی — گم بر و تصنع میں ہے سب جوش بیاں کا
عشاق کی جانب سے تقاضائے وفا پر — کہتے ہیں وہ جھگڑا یہ نکالا ہے کہاں کا
وہ گرم ہو یا سرد وہ خوشبو ہو کہ خوشرو — منظور نظر ہے دل بیتاب وہاں کا
کیا کہیے کہ رہتا ہے بہر حال تصور
حسرت ہمیں لندن کی اسی آفتِ جاں کا

ہم رات کو اٹلی کی حسینوں کی کہانی — سنتے رہے رنگینیٔ ڈوپا کی زبانی
آنکھوں کا تبسم تھا مرے شوق کا موجب — چتون کی شرارت ہے مری دشمنِ جانی
ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ معنبر — جھٹ چوم لیا ہم نے طبیعت ہی نہ مانی
ہوتی جو خبر اس کو تو کیا کیا نہ بگڑتی — ڈوپا نے غنیمت ہے کہ یہ بات نہ جانی
اٹلی میں تو کیا ہیں تو یہ کہتا ہوں کہ حسرت
دنیا میں نہ ہوگا کوئی اس شکل کا ثانی

آنکھ اس کی جو فتنہ بار اٹھی — ہر نظر الاماں پکار اٹھی
لیکے ہر جان کا شکیب جھکی — کر کے ہر دل کو بے قرار اٹھی
خیلِ خوباں شام سے وہ حسیں — بن کے سلطانِ روزگار اٹھی
دین و ایماں کی اس کے خیر کہاں — جس کی جانب نگاہِ یار اٹھی
کرکے آخر وہ فتنۂ پلتور — دلِ حسرت کا بھی شکار اٹھی

رعنائی میں حصہ ہے جو قرمز کی پری کا
نظارہ ہے مسحور اسی جلوہ گری کا

رفتارِ قیامت یونہیں کم تھی جو اس پر
اک طرہ فتنہ تری نازک کمری کا

پوشاک میں کیا کیا شجری نقش ہیں دلکش
باعث نہ یہی شوق کی ہوں جامہ دری کا

لاریب کہ اس حسنِ ستمگار کی شوخی
موجب ہے مرے ذہن کی عصیاں نظری کا

ساتھ اُن کے جو ہم آئے تھے بیروت سے حسرت
یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہم سفری کا

ہم نے ہر ہر بات اپنے حق میں جانی آپ کی
مہربانی ہے کہ ہے نامہربانی آپ کی

ہے نرالی سبز کی بھی رُتِ روشن پر بہار
اوڑھنی بہتر تھی لیکن ارغوانی آپ کی

خود غرض ہم کو بھی ٹھہرایا جو غیروں کی طرح
دیکھئے اچھی نہیں یہ بدگمانی آپ کی

آپ کے معشوق ہو کر عاشقی کی داستاں
کاش ہم بھی ایک دن سنتے زبانی آپ کی

اس گلِ رعنا کا حسرت یونہی کیا کم تھا جمال
ہوگئی ہے طرہ جس پہ خوش بیانی آپ کی

جب سوا میرے نہ تھا کوئی نشانا تیرا
یاد ہے مجھ کو ابھی تک وہ زمانہ تیرا

پا کے وہ گرم نظر مجھ کو سرِ عرشِ جہاز
کبھی چھپنا تو کبھی پھر نظر آنا تیرا

میرے اصرار پہ وہ ہاتھ چھڑا کر آخر
دستخط آپ سے اُردو میں بنانا تیرا

کچھ ادائی کے لئے شوق کو ٹھہرانا ہوس
مجھ سے کچھ خوب نہیں ہے یہ بہانا تیرا

دام اخلاص نہ ہو جن کی مروت حسرت
کیا قیامت ہے دل ایسوں سے لگانا تیرا

چادرِ جو کہیں حسنِ رُخِ یار کی سر کی
قابو میں طبیعت نہ رہی ذوقِ نظر کی

سوتے میں جو دیکھا تھا رُخِ یار کا عالم
آنکھوں میں یہ خنکی ہے اسی نورِ سحر کی

ہے شوق کبھی دیوانہ ترے نقشِ قدم کا
مائل کبھی عقیدت ہے ترے سجدۂ در کی

لغزش سی ہے جو اس کے قدم میں دمِ رفتار
یہ ناز کی مستی یہ نزاکت سی کمر کی

چاہا تھا کہ پھر ان کو نہ چھیڑیں گے یہ چھیڑا
خواہش کوئی پھر ان سے نہ کرنی تھی مگر کی

آجاتی ہے ناگاہ جدائی کی مصیبت
ہوتی ہے خبر کس کو ترے عزمِ سفر کی

یا حسن ہے یا عشق ہے اک نقش یہاں کا
کیا بات ہے اے شوخ ترے راہگذر کی

کچھ فائدہ حسرت نہ ہوا ضبطِ ہوس کا
پوشیدہ محبت نہ رہی "ش" لبسر کی

ماہرانہ

دل ہے غرقِ شادمانی جان سیرابِ نشاط
وصل کی شب ہے بہم ہیں جملہ اسبابِ نشاط

ہے جہانِ آرزو میں آج گویا روزِ عید
چل رہی ہے محفلِ دل میں مئے نابِ نشاط

حسرتیں وقفِ طرب ہیں آرزو محوِ سرور
بخت نے کھولا ہے رہِ شوق پر بابِ نشاط

ہیں فراہم اہلِ ذوق آمادہ ہے بزمِ طرب
اہتمامِ نغمہ سنجی میں ہیں اربابِ نشاط

ہوگئی جوشِ تمنا سے مبدل بیخودی
سازِ حسرت پر لگی جس وقت مضرابِ نشاط

کامیابِ عیش بیحد ہے دلِ عشرت نصیب
آرزو کے سر سے گزرا جائے ہے آبِ نشاط

ہے غرض ہر سمت اک ہنگامۂ شادی بپا
کچھ نہیں چلتی ملامت گر کی در بابِ نشاط

چل سکے گا اب نہ قابو دل پہ رعبِ حسن کا
یار بیخود ہو رہا ہے میں ہوں بیتابِ نشاط

ساز و سامانِ خرد سرمایۂ ہوش و حواس
آج لیجائے بہا کر سب کو سیلابِ نشاط

رشک سے بیتاب ہے نیرنگیٔ دورِ فلک
ہوشیار اے بیخبر اے غافلِ خوابِ نشاط

ہے اسی کا نام حرماں ہائے رے وصلِ یار
خاطرِ محرومِ حسرت کو نہیں تابِ نشاط

وہ قامتِ بلند نہیں وہ قبائے ناز
اک سروِ ناز ہے جو بنا ہو برائے ناز

اس نازنیں پہ ختم ہیں سب شیوہائے ناز
جس کو بنا کے خود بھی ہے نازاں خدائے ناز

حسرت موہانی

کیا کیا نہ آرزو کے بڑھیں دل میں حوصلے
رکھ دیں کبھی جو فرق ہوس پردہ ہائے ناز

اربابِ اشتیاق ہیں اور انتہائے شوق
حالانکہ حسنِ یار ہے اور ابتدائے ناز

ہم پر نگاہِ یار سے گزرا جو تھا کبھی
ہے آج تک وہ پیشِ نظر ماجرائے ناز

کچھ یوں ہی اپنے حسن پہ مغرور تھا وہ شوخ
کچھ لے اُڑی ہوا اور کبھی اس کو ہوائے ناز

اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار
اک بات ان میں اور بھی کچھ ہے ورائے ناز

پھیلی جو ان کے برقِ تبسم کی روشنی
بس رنہ نور ہو گئی یکسر فضائے ناز

حیرانِ کارِ حسنِ بتاں ہے زبانِ عشق
یعنی وہ مدح غمزہ کرے یا ثنائے ناز

شوقِ لقائے یار میں مرتے تو ہو مگر
حسرت جو نقدِ جاں بھی نہ ٹھہرے بہائے ناز

عشق میں خوفِ جاں سے در گزرے
ہم نے ٹھانی جو دل میں کر گزرے

زندگی اپنی ہو کے ان سے جدا
سخت گزرے گی اب اگر گزرے

دل کی مایوسیوں سے ان کے بغیر
رنج کیا کیا نہ جان پر گزرے

شامِ فرقت کٹے نہ ہجر کی رات
صبح گزرے نہ دوپہر گزرے

زندگی ہے اسی کا نام تو ہم
ایسی درماندگی سے در گزرے

ان سے اظہارِ شوق کون کرے
جان ہی سے کوئی مگر گزرے

خدمتِ بے نیازِ جاناں میں
کیوں مرے حال کی خبر گزرے

ان کے قدموں پہ رکھ دیا سرِ شوق
ہم یہ کیا بیخودی میں کر گزرے

منتظر ہے متاعِ جاں حسرت
کہ ادھر بھی وہ فتنہ گر گزرے

پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو
مجھ کو دیکھو مرے مرنے کی تمنّا دیکھو

جرمِ نظارہ پہ کون اتنی خوشامد کرتا
اب بھی وہ روٹھے ہیں تو اور تماشا دیکھو

کہنے سننے سے تو چھوڑیں گے نہ وہ صحبتِ غیر
چال اب ہم بھی کوئی چلتے ہیں اچھا دیکھو

ہم سے کہتے تھے بناوٹ ہے یہ سارا قصّہ
ہنس کے لو پھر وہ انھوں نے ہمیں دیکھا دیکھو

مستیٔ حسن سے اپنی بھی نہیں تم کو خبر
کیا سنو عرض مری حال مرا کیا دیکھو

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

سامنے سب کے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب
سر سے ڈھل جائے نہ غصّے میں دوپٹا دیکھو

دوستو ترکِ محبت کی نصیحت ہے فضول
اور نہ مانو تو دلِ زار کو سمجھا دیکھو

وعدۂ وصل کو ہنس ہنس کے نہ ٹالو کل پر
تم نے پھر آج نکالا وہی جھگڑا دیکھو

سر کہیں بال کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں
ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو

جان کیا چیز ہے رکھیں جسے ہم تم سے دریغ
ہو نہ باور تو کسی دن ہمیں فرما دیکھو

ہوسِ دید مٹی ہے نہ مٹے گی حسرت
دیکھنے کے لئے چاہو انھیں جتنا دیکھو

آئی جو ان کی یاد مرا دل ٹھہر گیا
دعویٰ غمِ فراق کا باطل ٹھہر گیا

تیرِ نگاہِ یار کا مشکل ہے سامنا
سینہ ہی تھا جگر کہ مقابل ٹھہر گیا

دل خوش ہوا جو آپ ہوئے مائلِ ستم
یعنی میں التفات کے قابل ٹھہر گیا

دل کو دلائے یار یہ حاصل ہوا قیام
پایا جو اس جہاز نے ساحل ٹھہر گیا

خواب و خیال ہو گئیں اگلی وہ صحبتیں
پھیر ابھی اس نواح کا مشکل ٹھہر گیا

بیچارگی میں رشتہ جو نکلی ان سے نام کی
مسکینِ جانِ زار ہوئی دل ٹھہر گیا

اچھا ہوا کہ مملکتِ حسن و عشق میں
حسرت وہ بادشاہ میں سائل ٹھہر گیا

سُرخیٔ حسن ہو ملبوس نگاہِ عارض
یا عیاں نور کے پردے میں ہو نارِ عارض

دیکھا صبحِ شبِ وصل بہارِ عارض
لیل گیسو سے نمایاں ہو نہارِ عارض

خوابِ راحت سے اُٹھے وہ تو بے زینتِ حسن
رونقِ صبح ہوئی آئینہ دارِ عارض

اس شۂ حسن کے ماتحت ہو دنیائے جمال
غلغلِ لب ختنِ جبہہ تتارِ عارض

گریۂ اہلِ تمنّا کے اثر سے حسرت
ملکِ خوبی میں ہے سرسبز جوارِ عارض

کچھ میرے حالِ زار کی ان کو خبر نہیں
کیا ہو جو میں ہی جا کے سنا دوں مگر نہیں

اک آفتابِ حسن درخشاں ہے وہ جمال
ہے مجھے اسے بغور یہ تابِ نظر نہیں

پہلو میں دل کو پوچھ رہی ہے نگاہِ یار
کیا جانے اب کوئی وہ کدھر ہو کدھر نہیں

کب تھے وہ میرے حال سے اسدرجہ بیخبر
کیونکر کہوں ہیں نالۂ دل میں اثر نہیں

ہم بیکسوں کو قتل جو کرتا ہے بے گناہ
کچھ اے عزیز تجھ کو خدا کا بھی ڈر نہیں

پرسش ہو میرے حال کی یارب جو روزِ محشر
اتنا بھی اب یہ قصۂ غم مختصر نہیں

ہلہ یار تک رسائی حسرت نہ کیوں محال
اس محفلِ سرور میں غم کا گزر نہیں

کیا کام انھیں پرسشِ اربابِ وفا سے
مرتا ہو تو مر جائے کوئی ان کی بلا سے

مجھ سے کبھی خفا ہو میری آہوں سے کبھی برہم
تم بھی ہو عجب چیز کہ لڑتے ہو ہوا سے

دامن کو بچاتا ہے وہ کافر کہ مبادا
چھو جائے کہیں پائے خونِ شہدا سے

دیوانہ کیا ساقیٔ محفل نے سبھی کو
کوئی نہ بچا اس نظرِ ہوش رُبا سے

اک یہ بھی حقیقت میں ہے شانِ کرم انکی
ظاہر میں وہ رہتے ہیں جو ہر وقت خفا سے

آگاہ غمِ عشق نہیں وہ ستمِ خوباں
اور یہ بھی جو ہو جائے فقیروں کی دعا سے

قابل ہوئے رندانِ خرابات کے حسرت
جب کچھ نہ ملا ہم کو گروہِ عرفا سے

اب ہم ہیں بھلا زیست کے آثار کہاں ہیں
تم پھر بھی کہے جاؤ یہ بیمار کہاں ہیں

مقتل میں یہ کہتے ہوئے آئے وہ بصد ناز
آئیں مرے جانباز گرانبار کہاں ہیں

ہم کو بھی کیا کم ہے کہ بندے ہیں تمھارے
دعوائے محبت کے سزاوار کہاں ہیں

سجدے کئے اس در پہ اسی عذر کے لاکھوں
ہم عاشقِ بیخود ہیں گنہگار کہاں ہیں

اک بار چلے جاؤ دکھا کر جھلک اپنی
ہم جلوۂ پیہم کے طلبگار کہاں ہیں

پوشیدہ ہم اس گوشۂ محفل میں ہیں خاموش
جس میں یہ نہ جانے نگہِ یار کہاں ہیں

کہنا ہے فریبِ نظرِ یار بھلا ہم
بے مہر جفاکار دل آزار کہاں ہیں

کافر جنھیں سب کہتے ہیں مسلم نہ ہوں حسرت
آزاد ہیں وابستۂ زنار کہاں ہیں

تیری جفا بھی ہو وفا اے بکمالِ دلبری
تیرے ستم سے دیتے ہیں لوگ مثالِ دلبری

بات ہے تیری حیلہ جو صرفِ نیازِ گفتگو
چال ہے تیری فتنہ خو مست بحالِ دلبری

اہلِ کمال کی نظر محوِ تماشا ہے دیکھ کر
چہرۂ حسنِ یار پر ندرتِ خالِ دلبری

مہرِ سپہرِ حسن ہو باخط و خالِ گل رخی
ماہِ تمامِ ناز ہو یا سن و سالِ دلبری

ذات پہ جن کی ختم تھا شیوۂ عہد پر ملا
آج ہیں برسرِ وفا پھر بخیالِ دلبری

حسرت پاکباز کے گریۂ شوق سے رہے
تازہ یونہیں خدا کرے تیرا نہال دلبری

ہم عاشقِ فاسق تھے ہم صوفیِ صافی ہیں
پی لیں جو کہیں اب بھی درخورِ معافی ہیں

بیکار تھی ململ بھی گرمی میں شبِ فرقت
کام آئینگی جاڑے میں فردیں جو لحافی ہیں

عقلوں کو بنا دے گا دیوانہ جمال اُن کا
چھا جائینگی ہوشوں پر آنکھیں وہ غلافی ہیں

ہم شکرِ ستم کرتے کیوں شکوہ کیا اُن سے
آئینِ محبت کے شیوے یہ منافی ہیں

ہم ان کی جفا سے بھی راضی تھے مگر ناحق
اب ہو گئے وہ خود نادم سرگرم تلافی ہیں

جدت میں ہو لاثانی حسرت کی غزل خوانی
کیا طرفہ مطالب ہیں کیا تازہ قوافی ہیں

نافعانہ

عشق کی روحِ پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر
اپنی جفا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر

جان کو محوِ غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطعِ رہِ مراد کر

غمزۂ دل فریب کو اور بھی جانفزا بنا
پیکرِ نازِ حسن پر رنگِ حیا زیادہ کر

خرمیِ دو روزہ کو عشرتِ جاوداں نہ جان
فکرِ معاش سے گذر حوصلۂ معاد کر

اگر نجاتِ ہند کی دل سے ہو تجھکو آرزو
ہمّتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمرو کے حد سے سوا اہم نجان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بعندِ مصلحت وقت یہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر

خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

منزلِ وصلِ یار ہے پیدا ۔۔۔ درمیانِ حدودِ بیم و رجا

دلِ انساں میں تابِ شعلۂ عشق ۔۔۔ حسنِ مطلق کی روشنیٔ حق میں ضیا

پردۂ عشق و حسن میں ہے وہی ۔۔۔ الغرض نورِ ارض و نورِ سما

پھر نہ کیوں وصلِ حسن و عشق سے ہو ۔۔۔ نورِ بالائے نور جلوہ نما

جان دیدی پہنچ کے انکے حضور ۔۔۔ ہم نے اور ان سے کچھ کہا نہ سنا

اے تری یادِ ستم جاں کا علاج ۔۔۔ اے ترا ذکر دردِ دل کی دوا

بے خطا بھی گناہگار ہیں ہم ۔۔۔ آپ جو کچھ کہیں وہی ہے بجا

ہم رضاکار ہیں خدا کی قسم ۔۔۔ ہم نہ ہوں گے مگر شہیدِ وفا

ہو گئے محوِ عشق سب حسرتؔ
اب غمِ ہجر ہے نہ شوقِ بقا

مرا ایماں عجب کیا ہے جو ایمانِ تصوّف ہے
تصوّف جانِ مذہب عاشقی جانِ تصوّف ہے

گناہ اپنا نہیں ثابت خطا کے پھر بھی قائل ہیں
ادب کا ہے یہی شیوہ یہی شانِ تصوّف ہے

ادب اک دوسرا ہے نام عشقِ روح پرور کا
جو رامِ عشق ہے جو زیرِ فرمانِ تصوّف ہے

تعلق حسن و حق میں بھی ہے العشق ہو اللہ کا
یہی تو اصلِ دین و رمزِ پنہانِ تصوّف ہے

گزر کر راہِ پیچا پیچ قدر جب سے حسرت
یقیں اپنا مقیم شہرِ عرفانِ تصوف ہے

نہ ہوئے آپ آشنائے خلوص — نہ سنی میری التجائے خلوص
ہم ہیں بیزار کبر و عجب و ریا — کیوں نہ درکار ہو دوائے خلوص
طے کرائے دل بزورِ علم و عمل — راہِ بیم و رجا بہ پائے خلوص
زہد و تقویٰ ریاضت و عزلت — بن گئے جبکہ دست و پائے خلوص
نفس و شیطان و غفلت و دنیا — سب پہ غالب ہوئی دعائے خلوص
دل کا تقویٰ ہے خیر خواہیِ خلق — ہے بشرطیکہ بر بنائے خلوص
فکرِ رزق و مصائبِ تقدیر — عارضِ حال تھے بجائے خلوص
سو بہ صبر و توکل و تفویض — بن گئے شیوۂ رضائے خلوص
توبہ و علم و حمد و شکر ہیں باب — شہر ہے شہر پُر فضائے خلوص
ذکر و فکر و ریاض و صوم و صلوٰۃ — سارے جھگڑے ہیں اک بمائے خلوص
ابہ حقیقت میں ان کے سب کے سوا — عشق ہے اصل مدعائے خلوص

ان کو اب ضد یہ ہے کہ حسرت بھی
شوق ظاہر کرے بجائے خلوص

جسمِ سنگِ کعبہ میں کیفیتِ جاں دیکھیے
پوششِ اسود سے پیدا بیضِ ایماں دیکھیے
سایۂ میزابِ رحمت میں بہ ایقانِ تمام
جذبۂ عشقِ حقیقی کو نمایاں دیکھیے

ماءِ زمزم سے ہوئی بالیدہ روحِ اتقا
صاف آئینے میں تشکلِ آبِ حیواں دیکھئے

ملتزم کو جانئے گر فی المثل آغوشِ حق
سنگِ اسود کو یہ شانِ دستِ یزداں دیکھئے

ذوقِ عرفاں ہو تو حسرت بیتِ حق میں ہر گھڑی
دیدۂ دل سے بہ ہر سو روئے جاناں دیکھئے

ضاحکانہ

گو بظاہر شیر ہوں باطن ہیں بودے دل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے پیسہ و گر باطل کے ہیں

فوج کو اپنی ہی دینا بل کے دشمن سے شکست
یہ نتیجے آپ ہی کی فکرِ لا طائل کے ہیں

ناز تھا شوقِ شہادت پہ ابھی کل تک جنھیں
دست و بازو آج گویا خود ہی قاتل کے ہیں

مل چکی سرکار استبداد میں جائے امام
حوصلے بیکار اس تجویزِ بے حاصل کے ہیں

پائیں گے البتہ آغا خان ثانی کا خطاب
گر یہی انداز اُن کی فہم ناقابل کے ہیں

مظہر و انصار مظہر نے یہ ثابت کر دیا
ہم میں اب بھی کچھ نمونے ناظم و کامل کے ہیں

کیوں نہ ہو خطرے میں حسرت قافلہ احرار کا
راہ زن ہوں جب وہی جو راہبر منزل کے ہیں

لائڈ جارج کی آئی شامت ۔ نکلا ٹھیک شعیب کا کہنا
ہجری سن میں لکھدو حسرت ۔ مردک نام کا اترا شحنہ

شاعرانہ

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجود حسن تو آگاہ رعنائی نہ تھا

عشق روزافزوں پہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو ناز یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جبکہ تیرا حسن سرگرم خودآرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دن کہ محو آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربط شناسائی نہ تھا

تو نے حسرتؔ کی عیاں تہذیب رسم عاشقی
اس سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

ادا نہ ہم سے ہوا حق تری غلامی کا
نصیب شوق رہا داغ ناتمامی کا

بچھی ہیں راہ تمنا میں سیکڑوں آنکھیں
کہ ناز جلوہ کرے تری خوشخرامی کا

کھلے نہ ہم سے خموشان آرزو کی زباں
جو اتفاق کبھی ہو ان سے ہمکلامی کا

حضور مجھ پہ نہ ضائع کریں عطا اپنی
کہ مستحق ہوں جفاہائے التزامی کا

بقدر شوق کہاں تاب التماس ہمیں
لکھیں جواب جو اس نامۂ گرامی کا

نہاں نہ ہو کرم یار میں ستم حسرتؔ
بہت نہ کیجئے اظہار شادکامی کا

اب تو اٹھ سکتا نہیں آنکھوں سے بار انتظار
کس طرح کاٹے کوئی لیل و نہار انتظار

ان کی الفت کا یقین ہو ان کے آنے کی امید
ہوں یہ دونوں صورتیں تب ہے بہار انتظار

میری آہیں نارسا میری دعائیں ناقبول
یا الٰہی کیا کروں میں شرمسارِ انتظار

راہ تیری اس قدر دیکھی کہ اے غفلت شعار
میری آنکھیں بن گئیں سرمایہ دارِ انتظار

ان کے خط کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال
کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ انتظار

ہے دلِ مسرورِ حسرت اک طرب زارِ امید
پھونک ڈالے گر نہ اس گلشن کو نارِ انتظار

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حسن سے شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لئے ہیں چلن تمام

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دل خوں ہو چکا ہے جگر ہو چکا ہے خاک
باقی ہوں میں مجھے بھی کر اے تیغ زن تمام

ہے نازِ حسن سے جو فروزاں جبینِ یار
لبریز آبِ نور ہے چاہِ ذقن تمام

نشو و نما ہے سبزہ و گل کی بہار میں
شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام

اس نازنیں نے جب سے کیا ہے وہاں قیام
گلزار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

نہ ہو اس کی خطا پوشی پہ کیوں نازِ گنہگاری
نشانِ شانِ رحمت بن گیا داغِ سیہ کاری

وفا سے دشمنی رکھ کر مرے دل کی طلبگاری
بہت مشکل ہے اس جنسِ گرامی کی خریداری

ہوئیں ناکامیاں بدنامیاں رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری

نہ چھوڑا اس نے دم تک ساتھ بیمارِ محبت کا
قسم کھانے کے قابل ہے ترے غم کی وفاداری

نہ ان کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ہے ممکن
کہیں آسان ہو یارب محبت کی یہ دشواری

نہ کرا تنا ستم ہم درد مندوں پر کہ دنیا سے
مبادا ایک قلم اُٹھ جائے تہذیب وفاداری

نہ دیکھے اور دلِ عشاق پر پھر بھی نظر رکھے
قیامت ہو نگاہِ یار کا حُسنِ خبرداری

یہی عالم رہا گر اس کے حسنِ سحر پرور کا
تو باقی رہ چکی دنیا میں راہ و رسمِ ہشیاری

وہ جرمِ آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہشِ تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری

چلا برسات کا موسم نہ چھوٹے قیدِ غم سے ہم
بڑی بے لطفیوں میں اب کے گذرا وقت میخواری

نسیمِ دہلوی کو وعدہ ہے فردوس میں حسرت
جزا اک شعر تیری شاعری ہو یا فسوں کاری

آنکھوں کو انتظار سے گرویدہ کر چلے
تم یہ خوب کار پسندیدہ کر چلے

میں ہوں مجبور دل ہے سودائی
رخصت اے صبر اے شکیبائی

حسن کو ہے سرِ خود آرائی
مژدہ اے آرزوئے شیدائی

نظر افروز اہلِ بینش ہے
تیری پنہائیوں میں پیدائی

متحقق ہے جلوۂ رُخِ یار
متحیر ہے شخصِ بینائی

ہے وہ رنگیں ادائیانِ وفا
جانِ محبوبیِ و دل آرائی

اثرِ حسنِ یار سے آخر
آگئی عشق میں بھی رعنائی

بندۂ بندگانِ حضرتِ عشق
حسرتِ سرفراز رسوائی

اب دل ہے نہ وہ عیشِ فراوانِ تمنّا
سب لوٹ لیا یاس نے سامانِ تمنّا

اب تک وہی رونق ہے سیہ خانۂ دل کی
باقی ہے جو اک شمعِ فروزانِ تمنّا

اب عشق کو درکار ہے اک عالمِ حسرت
کافی نہ ہوئی وسعتِ میدانِ تمنّا

تر گریہ حسرت سے ہے دامانِ تمنا
مجھ سا بھی نہ ہو کوئی پشیمانِ تمنا

ناکامیٔ پیہم سے جو ٹوٹا دلِ عاشق
سب چھوٹ گئے قیدیٔ زندانِ تمنا

پھر تازہ ہوا جوشِ جنوں فصلِ گل آئی
پھر شوق ہوا سلسلہ جنبانِ تمنا

گلگوں نہ ہوئیں اشکِ ندامت سے وہ آنکھیں
بے صرفہ ہوا خونِ شہیدانِ تمنا

امید ہی امید میں رہ جائے نہ حسرت
یوں ہی نہ گزر جائے یہ دورانِ تمنا

آج سن کر میرے نالوں کو ز راہِ التفات
زیرِ لب اس نے بھی کھینچی ایک آہِ التفات

دوستی اس فتنۂ دوراں کی ہے یادِ دشمنی
جانِ برباد کرم ہے دل تباہِ التفات

ہیں دلِ عشاق جب آگاہِ رسمِ حسن و عشق
بیرخی ہو ان کی ناحق عذر خواہِ التفات

شوق کا حسنِ عقیدت دیکھنا اکثر ہوا
تیری بے پروائیوں پر اشتباہِ التفات

ہے دلِ دیوانۂ حسرت ہلاکِ آرزو
اس طرف بھی اے ستمگر اک نگاہِ التفات

تھا مژدۂ بخششِ الٰہی
پیغامِ نسیمِ صبحگاہی

در پر ہے میرے وہ حق فراموش
ثابت ہوئی میری بے گناہی

ہے دل کی صلاح جاں فشانی
از راہِ کمالِ خیر خواہی

کچھ ربطِ جمالِ شوق کا حال
معلوم نہ ہو سکا کماہی

جاری ہے دیارِ عاشقی میں
فرمانِ ہلاکی و تباہی

زیبائشِ حسنِ دلبراں ہے
یہ کم نگہی یہ کج کلاہی

آرزوئے خلوص ہو تو لاریب
دنیا طلبی ہے دیں پناہی

دیتی ہے نگاہِ یار حسرت
آگاہی راز کی گواہی

تاثیرِ برقِ حسن جو اُن کے سخن میں تھی
اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

اک رنگِ التفات بھی اس بے رخی میں تھا
اک سادگی بھی اس نگہِ سحر فن میں تھی

محتاجِ بوئے عطر نہ تھا جسمِ دوستِ یار
خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا ورنہ آجکل
کیفیتِ بہار کی شدت چمن میں تھی

معلوم ہو گئی مرے دل کو زبانِ شوق
وہ بات پیار کی جو ہنوز اس دہن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

عیش گزارِ دل بھی غمِ عاشقی میں تھا
اک راحتِ لطیف بھی حسنِ محن میں تھی

اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے مٹ گئی
ہیبت سی اک جو خطرہ دار و رسن میں تھی

بہت خجل ہے ترے درد سے دوا میری
یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری

جدھر کو اب وہ چلائے ہے وہی ہو راہ مراد
رضائے یار سے وابستہ ہے رضا میری

چھپے وہ مجھ سے تو گویا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

کہیں وہ آکے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف
کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

کبھی چرا کے جو روزن سے میں تجھے دیکھوں
تو چور کی جو سزا ہو وہی سزا میری

وصالِ یار کی منزل قریب ہے حسرت
ہوئی ہے آرزوئے شوق رہنما میری

دلِ مایوس کو گرویدۂ گفتار کر لینا وہ اُن کا پردۂ انکار میں اقرار کر لینا

سکونِ یاس بھی ممکن نہیں اب ہم غریبوں کو قیامت ہے کسی کا وعدۂ دیدار کر لینا

کہیں آخر جو آتا ہے کہ ہو لیں شاد کچھ ہم بھی ہمارے بعد پاسِ خاطرِ اغیار کر لینا

ستم سے وہ نہ باز آئے تو ہم پر بھی ہوا لازم دلِ مجبور کو خو کردۂ آزار کر لینا

حصولِ رحمتِ حق کے لئے کافی ہے محشر میں رگِ عصیاں کو زیبِ طرۂ امتیاز کر لینا

حباب بھی یاد کرتے ہیں بہارِ خوں فشانی کے وہ میرا جیب کو دامن کو بھی گلنار کر لینا

یہ کیا ایذا پسندی ہے کہ حسرتؔ عشقِ جاناں میں
تجھے ہر عقدۂ آساں کو بھی دشوار کر لینا

بجا ہے عاشقی میں ہم کو دعویٰ سرفرازی کا کہ نکلا ہے ہمیں سے نام تیری دلنوازی کا

رہیگا حشر تک شانہ باقی عشق بازوں میں ہماری جانفشانی کا تمہاری بے نیازی کا

مٹا کر مجھ کو تکلیفیں مٹا دیں سب محبت کی ادا اس بے وفا نے کر دیا حق چارہ سازی کا

مصیبت اس کو راحت ہے فراغت اس کو زحمت ہے مزا کچھ دل کو ایسا پڑ گیا ہے عشق بازی کا

نظر بازی کی حسرتؔ خو بری ہے ورنہ لوگوں میں
بہت شہرا اپنا تھا ہم نے تیری پاکبازی کا

چھپ نہیں سکتی چھپانے سے محبت کی نظر پڑ ہی جاتی ہے رُخِ یار پہ حسرت کی نظر

یوں ہی گرویدہ نہیں کچھ تری صورت کی نظر مگر اس رنگ میں جویا ہے حقیقت کی نظر

گرچہ ہے پردۂ انکار میں ہم شکلِ عتاب پھر بھی ہے صاف نمایاں وہ اجازت کی نظر

حسن کا راز نہ پوشیدہ رہا ہے نہ رہے چاہنے والے بھی رکھتے ہیں قیامت کی نظر

ہجر میں رہنے لگی وہ بھی کچھ یاد ہمیں وہ مراعات کی باتیں وہ مروت کی نظر

آسرا ہم بھی لگائے ہوئے بیٹھے ہیں تیرا
اس طرف بھی کوئی ہو جائے عنایت کی نظر

ہو کے غلطیدۂ خوں تجھ کو مبارک حسرتؔ
ان کی رحمت کے یہ انداز یہ رافت کی نظر

مستی کے پھر آ گئے زمانے
آباد ہوئے شراب خانے

ہر پھول چمن میں زر بکف ہے
بانٹے ہیں بہار نے خزانے

سب ہنس پڑے کھلکھلا کے غنچے
چھیڑا جو لطیفہ صبا نے

سر سبز ہوا نہالِ غم بھی
پیدا وہ اثر کیا ہوا نے

رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی
واعظ کے نہ چل سکے بہانے

کردوں گا میں ہر ولی کو میخوار
توفیق جو دی مجھے خدا نے

ہم نے تو نثار کر دیا دل
اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے

ایسا تو ہوا کہ ہیں وہ نادم
اتنا تو کیا مری وفا نے

دل زخمیٔ غم ہوا جگر بھی
اک تیر سے دو اڑے نشانے

بیگانۂ مے کیا ہے مجھ کو
ساقی کی نگاہِ آشنا نے

مسکن ہے قفس میں بلبلوں کا
ویران پڑے ہیں آشیانے

اب دل ہے نہ عاشقی کے چرچے
سب خواب وہ ہو گئے فسانے

باقی نہ رہا وہ غم کا ساماں
جاری نہ رہے وہ کارخانے

اب کا ہے کو آئیں گے وہ حسرتؔ
آغازِ جنوں کے پھر زمانے

زمانِ فصلِ گل آیا نسیمِ مشکبار آئی
دلوں کو مژدہ ہو پھر جوشِ مستی کی بہار آئی

پھلا پھولا رہے گلزار یارب حسنِ خوباں کا — مجھے اس باغ کی ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی
سرِ پرشور بھی اک بار تھا جس کو مری گردن — ترے کوچہ میں آج اے فتنۂ دوراں اتار آئی
تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے — تماشا کامیاب آیا تمنّا بے قرار آئی
جو اُن کے حسن سے کچھ بھی بڑھ گئی ہے بیقراری میں — تڑپ ایسی کہاں سے عشق میں پروردگار آئی
یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے — ہوس نے کامِ جاں پایا محبت شرمسار آئی
بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی مگر حسرت
جو پھر بھی دلنوازی پہ وہ چشمِ سحرکار آئی

شبِ فرقت میں یاد اس بیخبر کی بار بار آئی — بھلانا ہم نے بھی چاہا مگر بے اختیار آئی
ترے فیضِ کرم سے دین کے دریا میں جوش آیا — ترے یمنِ قدم سے باغِ ایماں میں بہار آئی
تری محفل سے اے پیرِ مغاں عاشقی اکثر — مشیخت نے ترا دا آئی فضیلت ہیگار آئی
امیدیں تجھ سے وابستہ ہیں لاکھوں آرزو لیکن — بہت ہو کر تری درگاہ سے بے اعتبار آئی
الٰہی رنگ یہ کب تک رہیگا ہجرِ جاناں میں — کہ روزِ بیدلی گزرا تو شامِ انتظار آئی
تری بے اعتنائی کو یہ آخر کیا خیال آیا — جو میری پرسشِ غم کو بچشمِ اشکبار آئی
نہ ہاتھ آیا بجز رنج و بلا کچھ عشقِ حسرت کو
دیارِ حسن کی آب و ہوا ناسازگار آئی

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں — سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں
دیکھئے شوقِ شہادت میں جھکی ہے گردن — آپ اس وقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں
اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا — کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنّا نہ کریں
میں ہوں مجبور تو مجبور کی پرسش ہے ضرور — وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھا نہ کریں

دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں
آپ اس کام کو زنہار ارادہ نہ کریں

شکوۂ جور تقاضائے کرم عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں

عشق اور حسن سے بیزار ہو زنہار نہ ہو
ہم کبھی شکوہ کریں آپ کا حاشا نہ کریں

حال کھل جائے گا بیتابیٔ دل کا حسرت
بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

ہم نے اس بات کا شکوہ نہ کیا تھا نہ کریں
مشق بیداد میں ناحق وہ محابا نہ کریں

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی
ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں

رشک آتا ہے مجھے نور جو ہوتا ہے نثار
بام پہ آپ شبِ ماہ میں سویا نہ کریں

جان ہی سے نہ گزر جائیں کہیں اہلِ نیاز
شوق سے ناز کریں وہ مگر اتنا نہ کریں

غزل گوئی رہی یکتا میانِ عاشقاں میری
کہاں سے پھر کوئی لاتا بیاں میرا زباں میری

شبِ غم کیا خبر دیتی ہیں پیہم ہچکیاں میری
خداوندا انھیں کیوں یاد آئی ناگہاں میری

جہانِ حسن میں جب تک رہیگا آپ کا شہرہ
زبانِ عشق پر جاری رہیگی داستاں میری

ہمارے شکوہ ہائے سخت جانی پر وہ کہتے ہیں
ابھی دیکھی نہیں ہے آپ نے تیغِ رواں میری

نجانے تھا وہ ایسا کیا مزا فکرِ محبت میں
کہ جس کے نام پر مرتی ہے طبعِ شادماں میری

انھیں اب ناز ہے خود اپنی صورت پر کہ ہر سو سے
پرستش کر رہا ہے حسرتِ رنگیں بیاں میری

دل اور تہیۂ ترکِ خیالِ یار کرے
کسے یقین ہو کون اس پہ اعتبار کرے

قفس میں ہو دلِ بلبل شہیدِ فرقتِ گل
خزاں نے جو نہ کیا تھا وہ اب بہار کرے

قرارِ جاں کے لئے اس نے شیوۂ تسکیں
کبھی جو اور کیا ہے تو اختیار کرے

شبِ وصال ہے کوتاہ نازِ یار دراز
ہجومِ شوق سے کہہ دو کہ اختصار کرے

شکایت اس نگہِ تغافل کی اس قدر نہ کروں
کہیں وہ پھر نہ مجھے مل کے شرمسار کرے

قریب ہے کہ ترے گیسوئے دراز کی بو
نسیمِ باغ جوانی کو مشکبار کرے

وہ اب یہ چھیڑ سے کہتے ہیں میرے غم نے تجھے
نہ بیقرار کیا ہے نہ بیقرار کرے

میں کس خوشی سے دل و دیدہ فرشِ راہ کروں
اگر وہ ترک ادھر بھی کہیں گزار کرے

خدا سے اب یہ دعا ہے کہ جلد بادِ مراد
کہیں تلافیِ مافاتِ روزگار کرے

ہے اک پیام ہمارا بھی اے نسیمِ دکن
خدا تجھے طرب افزا و غم شکار کرے

ملے جو اس سے تو کہنا کہ تیرے شوق کا راز
کہاں تلک دلِ حسرت نہ آشکار کرے

ان کو جو شغلِ ناز سے فرصت نہ ہو سکی
ہم نے یہ کہہ دیا کہ محبت نہ ہو سکی

شب کا یہ حال ہے کہ تری یاد کے سوا
دل کو کسی خیال سے راحت نہ ہو سکی

پابوس کی بھی ہم کو اجازت نہ دے سکے
اتنی بھی تم سے قدرِ محبت نہ ہو سکی

کردی زبانِ شوق نے سب شرحِ آرزو
الفاظ میں اگرچہ صراحت نہ ہو سکی

لطفِ مزید کی میں تمنا تو کر سکا
تم یہ تو کہہ سکے کہ قناعت نہ ہو سکی

ایسا بھی کیا عتاب کہ ساقی بچی کچھی
آخر میں کچھ بھی ہم کو عنایت نہ ہو سکی

ان سے میں اپنے دل کا تقاضا نہ کر سکا
یہ بات تھی خلافِ مروت نہ ہو سکی

حسرت تری نگاہِ محبت کو کیا کہوں
محفل میں رات ان سے شرارت نہ ہو سکی

عشق میں جذب کیا اثر بھی نہیں
مر مٹے ہم انھیں خبر بھی نہیں

نہ ملے مگر ملا نہ سُرمۂ طور　　کیا تری خاک رہ گزر بھی نہیں
سخت یونہی تھی اک تو منزلِ عشق　　پھر کوئی دل کا ہم سفر بھی نہیں
چل چکا آپ کا فریبِ وفا　　اب ہیں اس درجہ بے خبر بھی نہیں
ہم کو اب شوقِ مے کہاں لیکن　　مفت مل جائے تو عذر بھی نہیں
بیدلی میں فغانِ شام تو کیا　　صورتِ گریۂ سحر بھی نہیں

بادہ نوشی میں ہیچ تو ہے حسرت
نفع شاید نہ ہو ضرر بھی نہیں

روح کو محوِ جمالِ رُخِ جاناں کر لیں　　ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کر لیں
ان کو لکھیں جو خطِ شوق تو اربابِ صفا　　نقشِ اخلاص کو زیبائشِ عنواں کر لیں
رنج راحت ہو اگر حسبِ تقاضائے مراد　　اہلِ تسلیم ترے درد کو درماں کر لیں
اہلِ ظاہر سے بچانا ہو تو لازم ہے کہ ہم　　پردۂ حال میں ترے شوق کو پنہاں کر لیں
کیا کریں اس کے سوا تیرے تغافل کا علاج　　کہ دلِ زار کو گردیدۂ حرماں کر لیں
جان دینا ہے تو کر دیں ترے قدموں پہ نثار　　کام مشکل ہو تو مشکل کو ہم آساں کر لیں
طالبانِ کرمِ یار بہ رنگینیٔ عشق　　دامنِ زہد پہ گلکاریِ عصیاں کر لیں
دل میں جا دیکھے ترے درد کو اربابِ ہوس　　اب بھی گر چاہیں تو گنجائشِ ایماں کر لیں

آپ انھیں شوق سے مہماں بلا لیں حسرت
کچھ مگر نذرِ دل و دیں کا تو ساماں کر لیں

گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی　　حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی
کس کس کو ملے زخم ترے تیرِ نظر کا　　کیا کیا ہوسیں تجھ سے ہیں مرغانِ حرم کی

لاریب ترے شوق کا انجام فنا ہے
پیوستہ اسی راہ سے ہے راہ عدم کی

مخمور طرب ہے رہِ الفت میں تمنا
لوٹی ہیں بہاریں جو ترے نقشِ قدم کی

یا ملنے میں وہ راضی ہیں مگر خط میں بظاہر
اب جو خفگی ہے وہ لڑائی ہے قلم کی

ہم پر جو کرم ہے تو عدو پر بھی نوازش
کیا خاک رہی قدر ترے قول و قسم کی

بے وجہ نہیں عشق میں خاموشی حسرت
منظور حفاظت ہے کسی رازِ اہم کی

کرم ساقیٔ میخانہ مبارک باشد
گرمیٔ مجلسِ رندانہ مبارک باشد

عید کا آج ہے دن بادہ پرستوں کے لئے
عشرتِ گردشِ پیمانہ مبارک باشد

جس کے دیدار کی مدت سے تمنا تھی سو آج
ہے وہی رونقِ کاشانہ مبارک باشد

دل فروشانِ تماشا کو بصد عیش و نشاط
دولتِ جلوۂ جانانہ مبارک باشد

جانِ حسرت کے لئے مایۂ نازش ہے یہی
اضطرابِ دلِ دیوانہ مبارک باشد

روشن جمالِ یار سے دنیائے عشق ہے
گویا شرابِ حسن بہ مینائے عشق ہے

اے ترکِ حسن ادھر بھی کہیں جلد کر گزار
غارت کے انتظار میں کالائے عشق ہے

کہتی ہے عقل دین بھی دنیا بھی کر طلب
ان سب سے منہ کو موڑ یہ ایمائے عشق ہے

کیا کام اسے طریقۂ اربابِ زہد سے
جو پیروِ شریعتِ غرائے عشق ہے

حسرت کا ہو بلند بھلا کیوں نہ مرتبہ
خدمت گزارِ حضرتِ والائے عشق ہے

اہلِ ہوس کو بھی سر و سودائے عشق ہے
یہ کفر ہے یہ ڈھونگ ہی بجائے عشق ہے

حسرت موہانی

جب سے سُنا ہے آپ کا آوازۂ جمال　　جس دل کو دیکھیے وہ مہیائے عشق ہے
پہنچا ہے جذبِ دل کا کہاں سے کہاں اثر　　اربابِ حُسن کو بھی تمنائے عشق ہے
مستی ہے اصطلاحِ محبت میں آگہی　　بیگانۂ خرد ہے جو دانائے عشق ہے
پنہاں حجابِ ناز میں ہے صورتِ جمال　　پیدا حروفِ شوق سے معنائے عشق ہے
نکلے جو تیری یاد میں اے نوبہارِ حُسن　　وہ اشک ہے کہ لولوئے لالائے عشق ہے
مدت کے بعد گو وہ ہوئے مائلِ کرم　　یہ بھی تو اک طریقہ احیائے عشق ہے

حسرت کہاں وہ شاہ کہاں تو گدائے حُسن
زنہار اگر تجھے سرِ سودائے عشق ہے

ہم پر جنوں کی تہمت بیجا ابھی سے ہے　　ہنگامۂ بہار کا غوغا ابھی سے ہے
وعدے کی شب ہجومِ تمنا ابھی سے ہے　　سرگرم کارِ خاطرِ شیدا ابھی سے ہے
آنے میں ان کے دیر ہے لیکن شبِ وصال　　پیشِ نظر وہ چہرۂ زیبا ابھی سے ہے
اے عشق تازہ کار تری ابتدا کو ہم　　جب سوچتے ہیں کہتے ہیں گویا ابھی سے ہے
برسے گا ہُن بہار میں اے پیرِ مے فروش　　تیری دُکان بادہ کا شہرا ابھی سے ہے
اہلِ نظر کا قول یہی ہے کہ بے مثال　　تیرا جمال اے گُلِ رعنا ابھی سے ہے

حسرت کو شامِ وصل ہے پاسِ حیائے یار
گو شوقِ پائے بوس کا ایما ابھی سے ہے

عاشق کو ہوئی فنائے فانی　　پیغامِ حیاتِ جاودانی
ہے کثرتِ شوق کا نتیجہ　　آنکھوں کی یہ آرزو فشانی
تھی ان کی نگاہ بے نگاہی　　اک طرفہ ادائے دلستانی

پھر آج وہ بر سرِ کرم ہیں	از راہِ کمال مہربانی
پھر گلشنِ آرزو ہیں گویا	آئی ہے بہارِ کامرانی
بیٹھے ہیں وہ روٹھ کر جو مجھ سے	چمکا ہے جمالِ سرگرانی
کچھ ایسے جدا ہوئے کہ ہم سے	پھر مل نہ سکا وہ یارِ جانی
کچھ داغِ فراق کے علاوہ	تم اور نہ دے چلے نشانی

اُردو میں کہاں ہے اور حسرت
یہ طرزِ نظیری و فغانی

جو اب ان سے ملنا دوبارا نہ ہوگا	تو جینا بھی شاید ہمارا نہ ہوگا
ہمیں پھر بھی لیجائیگا اس گلی میں	کہ اس کے سوا دل کو چارا نہ ہوگا
اجڑ جائے گی بزمِ رنداں جو ساقی	مروّت نہ ہوگی مدارا نہ ہوگا
ہمیں گھر میں لائے تو وحشت یہ بولی	یہاں پر ہمارا گزارا نہ ہوگا

کوئی شکوہ سنجِ ستم اور ہوں گے
وہ کہتے ہیں حسرت ہمارا نہ ہوگا

چھپے گی تری دوستداری کہاں تک	کرے گا دل انکارِ یاری کہاں تک
خدا جانے آخر ترے غمزدوں کو	ستائے گی بادِ بہاری کہاں تک
نظر باز اڑا لیں گے سب حال شب کا	چھپے گی وہ چشمِ خماری کہاں تک
سرِ راہ بیٹھے ہیں بے خواب و خور ہم	نہ نکلے گی ان کی سواری کہاں تک
کرے گی فقیرِ دل سے اے شاہِ خوباں	تغافل تری شہریاری کہاں تک
تمنا کو اس حد پہ رہنے نہ دے گی	ترے حسن کی بے قراری کہاں تک

کرو سیرِ دنیائے حیرت بھی حسرت
خرد مندی و ہوشیاری کہاں تک

خبر کیا تھی ترے عزمِ سفر کی — روانی رک چکی اب چشمِ تر کی
وہ عاشق مجھ سے پہلے تھے کہ ان کو — خبر تھی میرے شوقِ بے خبر کی
مری محرومیوں کا حال سن کر — انھیں اب فکر ہے ردِ اثر کی
مہوس ہیں بہت نازاں اکسیر — کہاں ہے خاک ان کے رہ گزر کی
وہ ہیں مجبورِ ناز و دلربائی — کہے دیتی ہے بیباکی نظر کی
دلِ آگاہ کو اے حسنِ رسوا — تری خواہش نہ کرنی تھی مگر کی

چلو سوئے عدم تم بھی کہ حسرت
وہیں کچھ قدر ہے اہلِ ہنر کی

منحصر وقت مقرر پہ ملاقات ہوئی — آج یہ آپ کی جانب سے نئی بات ہوئی
دلِ مشتاق میں اک شوق کا طوفان اٹھا — وعدۂ وصل کا دن ختم ہوا رات ہوئی
مذہبِ عشق میں ناکامیٔ جاوید کی خو — فرض منجملۂ احکامِ عبادات ہوئی
حسن کی نیم نگاہی بھی تمنا کے لئے — موجبِ ناز ہوئی وجہِ مباہات ہوئی

دمِ آخر وہ ملے بھی تو ملے کیا حسرت
کھیت جب سوکھ چکے اپنے تو برسات ہوئی

نخوت کہیں شادمانی کی دیکھی — بہت سیرِ دنیائے فانی کی دیکھی
مری چشمِ خونبار میں خوب رہ کر — بہار آپ نے گلفشانی کی دیکھی
تمنا نے اس روئے زیبا کو دیکھا — کہ تصویرِ حسنِ جوانی کی دیکھی

عجب شوق سے دستِ ساقی میں ہم نے — صراحی مے ارغوانی کی دیکھی

مجھے کر گئے مایوس بولے وہ حسرت
مسرت غم جاودانی کی دیکھی

آشنا ہو کے ہوئے یار سے ہم — سخت بیزار ہیں قرار سے ہم
سر ملائیں گے پھر دیدۂ عشق — کوچۂ حسن کے غبار سے ہم
کر چلیں پھر کہیں نہ کسبِ جنوں — سایۂ ابرِ نو بہار سے ہم
ازرہِ بے دلی بہ صحنِ چمن — خوش ہیں گل سے خفا نہ خار سے ہم

عاشقی ہو کہ شاعری حسرت
فرد نکلے ہر اعتبار سے ہم

وفا تجھ سے اے بیوفا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
تری آرزو ہے اگر جرم کوئی — تو اُس جرم کی سزا چاہتا ہوں
تجھے خیلِ خوباں سے اے جانِ خوبی — جُدا جانتا ماننا چاہتا ہوں
میں بیمارِ غم ہوں مداوائے غم کو — ترے در کی خاکِ شفا چاہتا ہوں
نصیحت گروں کی ملامت سے بے غم — میں اُس شوخ کو برملا چاہتا ہوں
اُسے بے بتائے وہ خود جانتے ہیں — جو میں اپنے حق میں دعا چاہتا ہوں

میں اُس طرۂ زلفِ مشکیں کو حسرت
بے غارتِ جاں دیتا چاہتا ہوں

پھر اک شوقِ بسیار کی آرزو ہے — طوافِ درِ یار کی آرزو ہے
جو لبریز ہو بادۂ عشقِ حق سے — پھر اس جامِ سرشار کی آرزو ہے

دو عالم کے افکار سے ہو کے فارغ رواں سبک بار کی آرزو ہے
گناہِ محبت کا بندہ ہوں مجھ کو جنونِ خطاکار کی آرزو ہے
متاعِ دل و جاں کو ہم لے کے حسرت
چلے ہیں خریدار کی آرزو ہے

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا
اثرِ تغافلِ یار سے شبِ تارِ ہجر میں دفعتاً
ہوئیں سوزِ غم کی یہ کثرتیں کہ دل و جگر سے دھواں اٹھا
ہے عجیب دلکش و جانفزا ترے کوچے حسنِ یار کا ماجرا
کہ اثر سے قوتِ عشق کے میں گرا تھا پیر جواں اٹھا
یہ خلوصِ غم کی نہ تھی کمی تو پھر اور کیا تھا کہے کوئی
کہ نہ داشتۂ دردِ دل ہوئی نہ ہنوز پردۂ جاں اٹھا
کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل اے دلِ مبتلا
مگر اب کیا ہے یہ حوصلہ تو خوشی سے نازِ بتاں اٹھا
یہ سزا کہاں یہ جزا ہوئی بخلافِ خواہشِ مدعی
پے قتلِ حسرتِ ملتجی خود اگر وہ جانِ جہاں اٹھا

پھر حالِ دل قرار سے بیزار ہو چکا جینا فراقِ یار میں دشوار ہو چکا
واں تک پہنچ پہنچ کے پھر آیا ہیں نامراد ایسا تو اس گلی میں کئی بار ہو چکا
اس شوخ بادہ خوار کو در بابِ میکشی اصرار ہے تو ہم سے بھی انکار ہو چکا

حسرت موہانی

رنگینیٔ سرشکِ محبت سے بارہا
دامانِ آرزو گل و گلزار ہو چکا

اب حسن و عشق سادہ ہیں وہ پاکبازیاں
تم شوخ ہو چکے ہیں ہوس کار ہو چکا

اہلِ نظر کو دیکھ کے مجبورِ اشتیاق
وہ حسن بے خبر بھی خبردار ہو چکا

حسرت نیازِ عشق بہ ایمائے نازِ حسن
راز آشنائے لذتِ آزار ہو چکا

ہم نے حسنِ جہاں سوز کا جلوا دیکھا
ہم نے گھر پھونک کے خوب آج تماشا دیکھا

کیا بتائیں دمِ نظارہ بفرطِ حیرت
کیا نہ دیکھا رخِ زیبا میں ترے کیا دیکھا

دلربائی میں ترے حسن کو پایا بے مثل
جاں نوازی میں ترے ناز کو یکتا دیکھا

کھنچ گئی نورِ علی نور کی تصویرِ جمیل
بعد کعبے کے جو آنکھوں سے مدینا دیکھا

ہم نہ کہتے تھے یہ لپکا نہیں اچھا حسرت
خاک میں مل گئے محبت کا نتیجا دیکھا

آئی جو یادِ یار بصد شانِ اعتنا
محرومیوں سے دل میں اٹھا شورِ مرحبا

بیتابِ آرزو ہو کیوں جانِ پاکِ عشق
بکھرے جو دوشِ حسن پہ وہ گیسوئے دوتا

دیکھ اے جفائے یار خدا کے غضب سے ڈر
بے جرم خونِ اہلِ تمنا نہیں روا

بیخود ہیں اہلِ شوق کہ اے نازنینِ حسن
خوشبوئے عاشقی میں بسی ہے تری ردا

اس حسنِ بے عدیل کی ہو کیا صفت بیاں
پیدا ہیں جس کے نور سے انوارِ کبریا

مجبورِ ہجر پا کے وہ مجھ کو دمِ فراق
حسرت کہیں نہ چھیڑ سے کہہ جائیں بیوفا

آنکھ اس کی جو فتنہ بار اٹھی
ہر نظر الاماں پکار اٹھی

حسرت موہانی

لٹکے ہر جان کا شکیب جُھکی
کر گئے ہر دل کو بے قرار اُٹھی

خیلِ خوباں شام سے وہ حسیں
بن گئے سلطانِ روزگار اُٹھی

دین و ایماں کی اُس کے خیر کہاں
جس کی جانب نگاہِ یار اُٹھی

کر گئے آخر وہ فتنۂ پلتوہ
دلِ حسرت کا بھی شکار اُٹھی

رعنائی میں حصّہ ہے جو قبرص کی پری کا
نظّارہ ہے مسحور اُسی جلوہ گری کا

رفتارِ قیامت یونہیں کیا کم تھی پھر اس پر
ایک طرّہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

پوشاک میں کیا کیا شجری نقش ہیں دلکش
باعث نہ یہی شوق کی ہو جامہ دری کا

لاریب کہ اُس حسنِ ستمگار کی سُرخی
موجب ہے مرے زہد کی عصیاں نظری کا

ساتھ اُن کے جو ہم آئے تھے بیروت سے حسرت
یہ روگ نتیجہ ہے اُسی ہمسفری کا

دل شکاری نہیں مانا کہ سرِ مو تیرا
کام کرتی ہے تری نرگسِ جادو تیرا

مشک و عنبر میں یہ تفریح کے سامان کہاں
پیرہن اُن کے کبھی کچھ ٹپکے ہے خوشبو تیرا

دلپذیری کے ہر انداز کی ہے تجھ سے نمود
رُخ بھی رنگین ہے ترا قد بھی ہے دلجو تیرا

جانِ عشاق کے لئے نیشِ محبت بنکر
بنے آزار ہوا عقربِ گیسو تیرا

آہ وہ رات کہ اس رات کو بادصفِ حجاب
سرِ حسرت کے لئے وقف تھا زانو تیرا

قیمتِ مے کہ یہ پیمانۂ جاں ہے ساقی
کون کہتا ہے کہ یہ نرخ گراں ہے ساقی

اُس شوخ کو رسوا نہ کیا ہے نہ کریں گے
ہم نے کبھی ایسا نہ کیا ہے نہ کریں گے

محفوظ رہے یہ راز ترے لطفِ ستم کا
اغیار میں چرچا نہ کیا ہے نہ کریں گے

بولے تو یہ بولے وہ تقاضائے کرم پر
یونہی سہی اچھا نہ کیا ہے نہ کریں گے

نسبت ہو تعارف کی جو اُن سے وہ رہیگی
تخصیص کا دعویٰ نہ کیا ہے نہ کریں گے

تدبیر کے قابل بھی نہوں گر نہوے ہم
تقدیر کا شکوہ نہ کیا ہے نہ کریں گے

اک تم کہ وفا تم سے نہوگی نہوئی ہے
اک ہم کہ تقاضا نہ کیا ہے نہ کریں گے

بے پردہ نہ دیکھا ہے نہ دیکھیں گے انھیں ہم
پاسِ دلِ شیدا نہ کیا ہے نہ کریں گے

بھولے تھے نہ بھولے ہیں نہ بھولیں گے انھیں ہم
ایسا نہ کیا تھا نہ کیا ہے نہ کریں گے

ہے قول یہ اغیار کے قابو میں بھی اُن کے
حسرت سے تو پردا نہ کیا ہے نہ کریں گے

واصفانہ

تا قیامت رہے قائم مرے سرکار کا باغ — وہ جسے کہتے ہیں سب حضرتِ انوار کا باغ
خاص آرام گہِ حضرتِ وہاب شہید — شاہ رزاق کا والی شہِ ابرار کا باغ
در و دیوار سے یاں جلوۂ حق کی ہے نمود — ہے بجا خلق میں مشہور یہ انوار کا باغ
مئے عرفاں کی لگی رہتی ہے ہر وقت سبیل — جائے رحمت ہے یہ رندانِ قدح خوار کا باغ
اہلِ دل کہتے ہیں سر کردۂ عشاق جسے — عاشقو ہے یہ اسی قافلہ سالار کا باغ

ہدیۂ حسنِ عقیدت ہیں یہ گل ہائے خلوص
نذرِ رزاق ہو حسرت مرے اشعار کا باغ

دستگیری کا طلبگار ہوں شیئاً للہ — میرِ بغداد میں ناچار ہوں شیئاً للہ
حالِ دل شرم سے ابتک نہ کہا تھا لیکن — آج میں درپے اظہار ہوں شیئاً للہ
کرمِ خاص کے لائق تو نہیں پھر بھی — آپ کا غاشیہ بردار ہوں شیئاً للہ
جلوۂ پاک نظر آئے تو بر آئے مراد — تشنۂ شربتِ دیدار ہوں شیئاً للہ
کیا کروں میری دعا بھی نہیں ہو مقبول — میں کہ اک فردِ گنہگار ہوں شیئاً للہ

غوثِ اعظم سے جو مانگو گے ملے گا حسرت
پھر کہو حاضرِ دربار ہوں شیئاً للہ

وہ نرگس گلِ گلشنِ رہنمائی | وہ سرمایۂ نازشِ مقتدائی
وہ زیبندۂ مسندِ مصطفائی | سلامے چو بوئے خوش آشنائی
بداں مردمِ دیدۂ روشنائی

بدرگاہِ آں دلبرِ دلربایاں | جزیں ہیچ ناید زما بینوایاں
دعائے چو حُسنِ تمنائے پایاں | درودے چو نورِ دلِ پارسایاں
بداں شمعِ خلوت گہِ پارسائی

خبر دار اے سیکشِ ناشکیبا | نہ کرنا کہیں ترکِ مے کا ارادا
بر آنے کو ہے تیرے دل کی تمنّا | ز کوئے مغاں رو مگرداں کہ آنجا
فروشند مفتاحِ مشکل کشائی

رہِ حق میں پہنچے جو کچھ کو اذیت | نہ اس سے ہر گز تری پست ہمت
رہے یاد حسرت یہ ہر دم نصیحت | مکن حافظا از جورِ گردوں شکایت
چہ دانی تو اے بندہ کارِ خدائی

درسِ حق جاری ہوا یاں کبھی حسرت آزاد کا | قید خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا
کامیابی پر غضب نازاں ہیں اربابِ ہوس | ہر طرف اک شور برپا ہے مبارکباد کا
ٹوٹ جائے کیوں نہ ہمت عاشقِ ناکام کی | جب نتیجہ کچھ نہ نکلے کوششِ برباد کا
جلوۂ امید گویا درمیانِ فکرِ دیاس | اک نمونہ ہے چراغِ رہ گذارِ باد کا
سن کے ذکرِ عشق رہ جاتے ہیں اکثر ہم خموش | اب تک اتنا اثر باقی ہے ان کی یاد کا
شاہِ جیلاں سے یہ حسرت عرض ہے اسلام کی
یوں نہ ہونا چاہیئے تھا فیصلہ بغداد کا

حسرت موہانی

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

پلٹے اس ڈھب سے کہ پھر ہو نہ جدا خاک مری
کہیں پہنچے بھی تو اس گوشۂ داماں کے قریب

لکھنؤ آنے کا باعث یہ کھلا آخر کار
کھینچ لایا ہے دل اک شاہدِ پنہاں کے قریب

وہ جو ہیں پاس تو مجلس بھی ہے اک باغ ہمیں
کامرانی بھی نمودار ہے حرماں کے قریب

روز ہو جاتی ہے رویا میں زیارت حسرت
آستانِ شہ رزاق ہے زنداں کے قریب

برکتیں سب ہیں عیاں دولتِ روحانی کی
واہ کیا بات ہے اس چہرۂ نورانی کی

شوق دیکھے تجھے کس آنکھ سے اے مہرِ جمال
کچھ نہایت ہی نہیں تیری درخشانی کی

مجھ سے وہ سگ بھی ہوا افضل جسے عزت ہو نصیب
آستانِ حرمِ یار پہ دربانی کی

مشکلوں سے جو مقابل ہوئی ہمت میری
قدر باقی نہ رہی عیشِ تن آسانی کی

رہ گیا جل کے تری بزم میں پروانہ جو رات
کھینچ گئی شکل مری سوختہ سامانی کی

رشکِ شاہی ہو نہ کیوں اپنی فقیری حسرت
کب سے کرتے ہیں غلامی شہِ جیلانی کی

ہر درد ہر مرض کی دوا ہے تمھارے پاس
آتے ہیں سب یہیں کہ شفا ہے تمھارے پاس

حسرت موہانی

سمجھاؤ لاکھ دل کو پر آتا نہیں قرار
اس کا بھی کچھ علاج بھلا ہے تمہارے پاس

سب حل ہوں مشکلیں جو ملے دولتِ یقیں
لوحِ طلسم بیم و رجا ہے تمہارے پاس

مانو کہ اب جلاؤ ہمیں تم، ہے اختیار
سر رشتۂ فنا و بقا ہے تمہارے پاس

حسرت کرو نہ دل میں زیارت حضور کی
آئینہ رسول نما ہے تمہارے پاس

امامِ برحق اہلِ رضا سلام علیک — شہیدِ معرکۂ کربلا سلام علیک
گلِ مرادِ ولایت حسین ابن علی کرم — تتمۂ شرفِ مصطفےٰ سلام علیک
ثبوت یہ ہے کہ نور شہادت کبریٰ — تری جبیں سے نمایاں ہوا سلام علیک
عبث ہو اور کہیں راہِ صبر حق کی تلاش — تری مثال ہو جب رہنما سلام علیک

ترے طفیل میں حسرت بھی ہو شہید وفا
یہی دعا ہے یہی مدعا سلام علیک

ہوتی ہے روز بارشِ عرفاں مرے لئے — گویا بہشتِ عشق ہے زنداں مرے لئے
ناکامیٔ طلب میں کہ ہے جانِ عاشقی — گنجینۂ مراد ہے پنہاں مرے لئے
نزدیک ہو کہ شوق سنے وعدۂ وصال — لب ہائے نازِ یار ہیں لرزاں مرے لئے
عشقِ بتاں و ذوقِ سماع و ہوائے مے — زاہد کے حق میں کفر ہے ایماں مرے لئے
حسرت کوئی مدد نہ کرے کیا مضائقہ — کافی ہیں غوثِ اعظم جیلاں مرے لئے

مرید آپ کے اہلِ صفا کے پیر ہوئے — جو تھے فقیر امیروں کے وہ امیر ہوئے
ضیائے روح کا اُن روشنوں کے کیا کہنا — سراج نور نبوت سے جو منیر ہوئے
جبھی میں ہو نہ سکا فتنۂ جفائے عدو — وہ کہہ چکے تھے کہ ہم تیرے دستگیر ہوئے
ہماری دھوم بھی دنیائے عاشقی میں ہوئی — وہ جب سے عالم خوبی میں بے نظیر ہوئے

غلام حضرتِ رزاق کیا ہوئے حسرت
کہ آپ نام خدا عاشقوں کے میر ہوئے

علیؓ کے لال زہراؓ کے دلارے — رسول اللہ کی آنکھوں کے تارے
نمونے شیوۂ خلقِ حسنؓ کے — نمایاں ہیں تری سیرت میں سارے
ہوئے ابدال کامل دزد و رہزن — بیک دم تیری تیغ حق کے مارے
کسی کی اور کیا پروا ہو ان کو — جنہیں کافی ہوئے تیرے سہارے
بھلا ساقی کوئی دن فصلِ گل کے — جدائی میں تری کیونکر گزارے

کرو حسرت حضورِ میرِ بغداد
جمالِ نورِ مطلق کے نظارے

عرفانِ عشق نام ہے میرے مقام کا
حامل ہوں کس کے نغمۂ نے کے پیام کا

متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے اُنس
دنیائے جاں میں شور ہے اس کے دوام کا

مخلوق اک نگاہِ کرم کی امیدوار
مستانہ کر رہی ہے بھجن رادھے شیام کا

محبوب کی تلاش ہوئی رہبر محب
بر آنے سے جو قصد کیا نند گام کا

گوکل کی سرزمیں بھی عزیز جہاں بنی
کلمہ پڑھا جو اُن کی محبت کے نام کا

برسانے کا بن بھی رہ رشکِ جنت بنا کہ تھا
پامالِ نازِ کفش کی بہارِ خرام کا

بسر یہ نور ہے دلِ حسرت زہے نصیب
اک حسنِ مشک فام کے شوقِ تمام کا

مظہرِ شانِ کبریا صلِّ علیٰ محمدٍ
آئینۂ خدا نما صلِّ علیٰ محمدٍ

موجبِ نازِ عارفاں باعثِ فخرِ صادقاں
سرورِ خیلِ انبیا صلِّ علیٰ محمدٍ

مرکزِ عشقِ دلکشا مصدرِ حسنِ جانفزا
صورت و سیرتِ خدا صلِّ علیٰ محمدٍ

مونسِ دلِ شکستگاں پشت پناہِ خستگاں
شافعِ عرصۂ جزا صلِّ علیٰ محمدٍ

حسرت اگر کرے ہے تو بخششِ حق کی آرزو
وردِ زباں رہے سدا صلِّ علیٰ محمدٍ

سلام علیک اے جوارِ مدینہ
جوارِ سراپا بہارِ مدینہ

زہے راحتِ یقظہ و نوم اینجا
زہے لطفِ لیل و نہارِ مدینہ

سویدائے دل ہے دلِ حسنِ حق کا
نہیں یہ شب نور بارِ مدینہ

مشامِ تمنا میں خوشبوئے جنت
پھرے لیکے ہم یادگارِ مدینہ

مدینہ چلے کیوں نہ ہر سال حسرت
بلائیں جو خود تاجدارِ مدینہ

طلب عادت نہیں اہلِ رضا کی — یہ لغزش تھی زبانِ مدعا کی
عبارت ہو مرے ذوقِ فنا سے — اشارت اُس نگاہِ آشنا کی
بقدرِ شوق اربابِ نظر سے — ترقی اُن کے حسنِ خود نما کی
عبارت بیکسی ہے عاشقوں کو — حکایت اس جمالِ دلربا کی

سبب حسرت ہوئی فیضانِ حق کا
نظر لطفِ کبیر الاولیا کی

مایوس نہ کر کہ میں غدا یا — جب تو نے طلب کیا تو آیا
فالحمد کہ آج بعد اک سال — پھر شوق ترے حضور لایا
والشکر کہ بعد سعی بسیار — پھر حاصل دست بوس پایا
یعنی بصد اہتمام تقبیل — سر تیری جناب میں جھکایا
پھر مسجد خیف میں پہنچکر — حظ کیف صلوٰۃ کا اُٹھایا
مژدہ عرفات نے پھر اک بار — غفرانِ ذنوب کا سُنایا
مزدلفہ کی راہ سے منا تک — پھر شوقِ طواف کھینچ لایا
دسویں ذی الحجہ کو عصر کے وقت — پیغامِ قبولِ حج آیا

مومن کی زمیں میں تو نے حسرت
حج کا یہ ترانہ خوب گایا

یسر ہے شاہِ نجف کی غلامی — زہے کامرانی زہے شادمانی
ملے مجھ کو بھی مثل سلمانؓ و بوذرؓ — وہی خواجہ تاشی وہی نیک نامی
وہ بیخوف و غم کیوں نہ بنگئے ہوں — حقیقت میں شیرِ خدا جس کے حامی

پہنچ کر درِ شاہِ مرداں پہ اکثر   خصوصی شرف پا گئے ہم سے عامی
نظر آئے مولا کے روضے پہ حسرت
عقیدت کو انوار بھی مثلِ جامی

بہ ملکِ تمنّا بصد طرفہ کاری   ترا شوق کرتا رہے شہریاری
ترے در پہ عشاق اے شاہِ خوباں   غلامانہ کرتے رہیں جاں نثاری
رضا تیری ثابت ہو اپنی خوشی سے   مقدّم بہ آئینِ خدمت گزاری
تری نذر کو لائے ہیں نقدِ جاں ہم   بصد عذر خواہی بصد شرمساری
شرف رکھتی ہے بادشاہی پہ بیشک
مدینے کی حسرت غریب الدیاری

✣ ✣ ✣ ✣ ✣

باغیانہ

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلماں رہ جائیں یوں خوار ہو کر

اُٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب
ہمارے ستانے پہ تیار ہو کر

تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر

کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر

وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حبِّ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے

دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ حزم و حجاب دیکھئے کب تک رہے

تا بکجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بنزیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بےعدد و بےحساب دیکھئے کب تک رہے

ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزمِ حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
ازرہِ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

کوشش وصالِ یار کی معذور ہو چکی
اب ہم سے خدمتِ دلِ رنجور ہو چکی

عرضی جنابِ حسن میں بھجوا کے شوق کو
ہر دم ہے اب یہ سوچ کہ منظور ہو چکی

حسرت موہانی

دستور کے اصول مسلّم ٹھہر چکے — شاہی بھی رام غلبۂ جمہور ہو چکی
سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں کیوں نہ ہوں — معلوم سب کو قوتِ مزدور ہو چکی

اور آپ اس سے چاہتے کیا ہیں سوائے سوز
حسرت یہ نازِ عشق ہے یہ نور ہو چکی

خود ہم کو بلانے لگے دے دے کے وہ قسمیں — باقی نہ کوئی فرق رہا عشق و ہوس میں
موقع ہے عجب کشمکشِ لطف و ستم کا — قابو میں ہیں وہ ناز کے ہم شوق کے بس میں
نسبت ہو وہی عاشقی و حسن میں باہم — فی الجملہ ہوا کرتی ہے جو شعلہ و خس میں
لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سویت — وہ ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

یاد اُن کی ہوئی وجہ سکوں ہجر میں حسرت
بُلبُل کے لئے بادِ بہار آئی قفس میں

جائز نہیں چاہ اُس کی مصیبت یہ بڑی ہے — کس فتنۂ ایماں سے کہاں آنکھ لڑی ہے
ہر لحظہ ہے رسوائی کونین کا دھڑکا — ہر ساعتِ شوق اپنی قیامت کی گھڑی ہے
پہلے تو کرم خود ہی کیا تم نے، پھر اب کیوں — آنکھوں سے لگی اشکِ ندامت کی جھڑی ہے
ہم کو یہ تری سرزنشِ مرحمت آلود — کیونکر نہ گوارا ہو کہ پھولوں کی جھڑی ہے

کیا حُسن پرستی بھی کوئی عیب ہے حسرت
ہونے دو جو اخلاق کی تنقید کڑی ہے

شرح دیوان غالب

ختم شد

شرح دیوان اُردو غالب ـ طباطبائی ـ جو عرصہ سے نایاب تھی اب طبع ہو گئی ہے
انوار بک ڈپو سے طلب فرمائیے